

FICTION HOUSE

پنجابی کی مشہور کتاب "سمہہ دوار: پنجاب تے اوہدے رنگ" کا ترجمہ

تاریخِ پنجاب کے متنازعہ پہلو

(سیاسی، ثقافتی اور علمی زاویے)



مخدوم ٹیپو سلمان



مخدوم ٹیپو سلمان سپریم کورٹ کے وکیل ہیں اور پچھلے بائیس سال سے آئینی وکالت کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ فلسفہ، قانون، پاکستانی تاریخ، ناول اور کہانیوں کی انگریزی، اردو اور پنجابی زبانوں میں سات کتابیں لکھ چکے ہیں۔



کتاب کے بارے میں:

- سنتے آئے ہیں کہ پنجابی ایک بے غیرت قوم ہے۔ جب بھی کسی فوج نے اُن پر حملہ کیا، انہوں نے لڑنے کے بجائے ہتھیار ڈال دیئے۔
- کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟ اگر ایسا نہیں تو تاریخ میں ان جنگوں کا ذکر کیوں نہیں جو پنجابیوں نے لڑیں؟
- اگر پنجابی بے غیرت نہیں ہیں تو اپنی مادری زبان کیوں چھوڑتے جا رہے ہیں؟
- پنجاب نے کبھی کوئی بڑا شخص بھی پیدا کیا ہے؟
- پنجاب کی ثقافت کیا اس قابل ہے کہ اس پر فخر کیا جا سکے؟
- یہی سب باتیں ہیں، اس کتاب میں۔



فکشن ہاؤس

لاہور • حیدر آباد • کراچی

@fictionhousepublishers www.fictionhouse.com.pk

ISBN 978-969-562-774-7

9789695627747

نام کتاب : تاریخ پنجاب کے متنازعہ پہلو (سیاسی، ثقافتی اور علمی زوایے)
مصنف : مخدوم ٹیپو سلمان
پنجابی سے ترجمہ : وفا مرزا
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت : 2020ء
قیمت : 300/- روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-1,37249218
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

ترتیب

1

پہلی بات

جوان گھوڑے پر سوار جارہا تھا۔ راستے میں رُک کر اُس نے کھیتوں سے مُولیاں توڑ کر کھائیں اور دوبارہ گھوڑے پر جا بیٹھا۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی پگڑی اتاری، گھڑے سے پانی پیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ یہ منظر پنجاب کے ایک گاؤں کا ہے، بتاؤ یہ کس زمانے کا ہے، تو میں تذبذب میں پڑ جاؤں گا۔ پنجاب کے دیہاتوں میں یہ سب پچاس برس پہلے بھی ہوتا تھا، سو برس پہلے بھی، پانچ سو برس پہلے بھی، ہزار برس پہلے بھی اور دو ہزار برس پہلے بھی۔ ہزاروں سال سے پنجاب کے حالات ایک سے

ہیں۔ وہی کسان، وہی کھیت، وہی ہَل، وہی بیل، وہی گھوڑے، وہی گھڑے، وہی برادریاں اور وہی خاندان۔ ہزاروں سال سے پنجاب کے حالات ایک سے ہونے کی وجہ سے زندگی بھی ایک سی تھی۔ اس لیے ہزاروں برس سے پنجاب کی کہانیاں ایک سی ہوتی تھیں۔ فصلوں پر پانی کی تقسیم کے جھگڑے۔ گھڑ دوڑ اور میلوں ٹھیلوں کے معاشقے، شادی کی خوشیاں اور جنازوں کے بَین۔

ہزاروں برس سے پنجابی زبان کی جو کہانی بھی سنائی جاتی ہے، وہ یہی تھی۔ پنجاب کا ایک گاؤں تھا جس میں ایک چودھری اور اُس کا خاندان برادری تھے، کچھ دوستیاں اور دشمنیاں تھیں۔ گاؤں کے چوپال میں یہ ہوا، یا کھیتوں میں یہ۔ یہی ہر کہانی کی بُنت تھی اور اسی میں تھوڑا ردوبدل کر کے نئی کہانیاں بنالی جاتی تھیں۔ ویسے تو یہ کوئی بُری بات نہیں تھی۔ جب حالات ہی ایک سے تھے تو کہانیاں بھی ایک ہی طرح کی ہونی تھیں۔ صنعتی انقلاب سے پہلے ساری دُنیا کے حالات ایک جیسے تھے اس لیے ان کی کہانیاں بھی ایک سی ہوتی تھیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کی کہانی تبدیل ہو گئی، نفسیاتی ہو گئی، ٹیکنولوجیکل ہو گئی۔ ڈپریس ہو گئی، عجیب و غریب ہو گئی۔ ڈسٹورٹ (Distort) ہو گئی، نئی اور تبدیل ہو گئی۔

ایلون ٹوفلر نے اپنی کتاب 'فیوچر شوک' میں کہا ہے کہ

ٹیکنولوجی کی تبدیلی کے ساتھ حالات بہت تیزی سے بدل جاتے ہیں۔ اس لیے ایک تو آج کے انسان کے لیے بڑوں کی مثالیں اتنی مفید نہیں ہوتیں جتنی پہلے زمانے میں ہوتی تھیں اور دوسرا، ہر پانچ سات سال کے بعد حالات اتنے بدل جاتے ہیں کہ نہ تو پہلے کی اقدار لاگُو ہوتی ہیں، اور نہ ہی وہ عقل دانش کام آتی ہے۔ ہر گزرتے سال کے ساتھ زندگی کو نئے ڈھنگ سے دیکھنا اور سمجھنا پڑتا ہے۔

مغربی دنیا نے تو زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کے زاویے اپنے حالات کے ساتھ ہی بدل لیے۔ اپنی اقدار بھی بدل لیں اور اپنی کہانیاں بھی۔ مگر پنجاب نے اب تک خود کو نہیں بدلا۔ پنجاب کے حالات بھی دُنیا کے ساتھ تبدیل ہو چکے ہیں، لیکن پنجاب کی کہانیاں اب بھی صدیوں پرانے حالات پر ہی ہوتی ہے۔ پنجابی زبان کی کہانی ایک تو پنجاب کے بارے میں ہی ہو گی اور پنجاب کے بارے میں ہونے کا مطلب ہے کہ پنجاب کے گھڑ دوڑ والے دیہات کے بارے میں ہو گی، جہاں چودھری ہوں گے، مزارعے ہوں گے اور خاندان ہو گا۔ پنجابی زبان کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ بھی یہی ہے۔

کہانی، زبان کے لیے ضروری ہوتی ہے، لیکن پہلے تو کہانی اس زندگی کے بارے میں ہونی چاہیے جو زبان بولنے والے گزار

رہے ہوں۔ جس طرح وہ زندگی کو دیکھتے ہوں اور جس طرح زندگی اُنہیں برت رہی ہو اور دوسرا، کہانی کے حالات وواقعات کا تانابانا آج کے مسائل کے بارے میں ہوناچاہیے، نہ کہ پچھلے زمانے کے بارے میں۔

آج تک کی جانے والی انسانی ایجادات میں سب سے بہترین ایجاد 'زبان' ہے۔ اس لیے کہ انسان نہ توکسی کی سوچ پڑھنے کے قابل ہے، اور نہ اس کے جذبات اور احساسات سمجھ سکتا ہے۔

صرف زبان ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے احساسات اور سوچ کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس طرح انسانی دماغوں کا زبان کے وسیلے سے ایک کمپیوٹر نیٹ ورک کی طرح، انسانی جسم میں ایک نظام قائم کر لینا، انسانی ارتقا کی اولین منزل ہے۔ زبان نہ صرف اس قابل ہونی چاہیے کہ وہ انسانی احساسات اور جذبات کا اظہار کر سکے، بلکہ ہر طرح کے علمی، منطقی، سائنسی اور فنی بحث کرنے کے قابل ہونی چاہیے۔ زبان کے وجود کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک لفاظی اور دوسرا قواعد کے اصول و ضوابط۔ کوئی بڑی زبان بنتی ہی تب ہے جب اس کے قواعد کے اصولوں میں ہی رہتے ہوئے اس میں یہ طاقت ہو کہ وہ الفاظ کی مختلف اور انوکھی بُنت بنا کر ہر طرح کی سوچ اور ہر طرح کے

جذبے کا اظہار کر سکے۔ جس بولی اور زبان میں یہ عنصر جتنا زیادہ ہو گا، وہ زبان اتنی ہی زیادہ تکنیک اور زاویے پیش کر سکے گی اور نئی سے نئی اور انوکھی بات بھی کر سکے گی۔ زمانہ جدید کے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے نئے مسائل، نئے خیالات اور نئے جذبات کو بیان کر سکے گی۔ یعنی زمانے کے ساتھ چل سکے گی اور زندہ رہ سکے گی۔ کسی بھی زبان میں یہ لچک اور وسعت پیدا کرنے کے لیے اسے آٹے کے پیڑے کی طرح بیلنا پڑتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی بات ہر ڈھنگ سے کرنا پڑتی ہے۔ اس زبان میں زیادہ سے زیادہ رنگ بھرنے سے اس کا کینوس وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کام کے لیے صرف کہانیاں لکھنا ہی ضروری نہیں، بلکہ ادب، فنون لطیفہ، سائنس، منطق، تاریخ، فلسفہ، سیاست، معیشت اور قانون پر ہر طرح کی بحث کرنے اور لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سقراط سے پہلے یونانی فلسفیوں کا کہنا تھا کہ ہماری زندگی اس طرح گزر رہی ہے جیسے ہم تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور گھوڑا آگے جا رہا ہے، ہمارا چہرہ اس منظر کو دیکھتا ہے جو گزر چکا ہوتا ہے، اسی طرح ہم اپنے ماضی کو دیکھتے ہیں جبکہ مستقبل کی جانب ہماری پشت ہوتی ہے۔ ہم اپنے ماضی سے ہی یہ پیشن

گویئاں کرتے رہتے ہیں کہ حالات یونہی رہیں گے اور آنے والے وقتوں میں بھی وہی ہو گا، جو پہلے ہو چکا ہے۔ اور پرانے زمانے میں ہوتا بھی یونہی تھا۔ صدیوں تک حالات ایک سے رہتے تھے۔ جن سے ایک ہی طرح کے مسائل جنم لیتے اور ان کا حل بھی ایک سا ہی ہوتا تھا۔ مسائل سے نمٹنے کے آزمودہ نسخے پچھلی نسلیں بتا جایا کرتی تھیں اور بزرگوں کے یہ نصائح نسل در نسل کام آتے تھے مگر پچھلے پچاس برس سے کافی کچھ بدل چکا ہے۔ اب حالات بھی کچھ ہی سال بعد تبدیل ہو جاتے ہیں۔ نئے حالات کے مسائل بھی نئے ہوتے ہیں جن سے نمٹنے کے لیے حل بھی نئے چاہیے ہوتے ہیں۔

یہ زبان ختم ہونے والا مسئلہ بھی نیا ہے۔ تاریخ میں پہلے کبھی یہ نہیں ہوا کہ بڑی زبانیں، چھوٹی زبانوں کو ختم کر ڈالیں۔ زبانیں ختم بھی اس طرح ہوتی تھیں کہ آہستہ آہستہ حالات کے ساتھ تھوڑا بہت بدلتے ہوئے وہ ایک نئی شکل اختیار کر لیتی تھیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی قوم اپنی ماں بولی کو گھٹیا اور کمتر سمجھ کر بولنا ہی چھوڑ دے۔ یہ مسئلہ نئے حالات کا ہے اور دنیا کے گلوبل ویلج بن جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

آج کل، ایک ملک کے لوگ بڑی آسانی سے، دوسرے ممالک تعلیم حاصل کرنے، نوکریاں اور کاروبار کرنے اور سیر و تفریح

کرنے جاسکتے ہیں اور جاتے بھی ہیں۔ آج کل کچھ ممالک بہت امیر ہو چکے ہیں اور کچھ بے حد غریب رہ گئے ہیں۔ یہ امیر ممالک علم و ادب میں بہت ترقی کر رہے ہیں اور یہ زبانیں پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں اور غریب ملکوں کی زبانوں کو نگلتی جارہی ہیں۔ کم تر ممالک میں رہنے والے یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا پر چھا جانے والی زبانوں کو بولنے والے امیر بھی ہیں اور علم و ادب کے میدان میں نئے تجربات بھی انہی زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ لازماً یہ امیر ملکوں کی زبانیں اعلیٰ ہیں اور ہماری زبان گھٹیا اور کمتر ہے۔ یہی سوچ کر وہ اپنی ماں بولی چھوڑ کر بڑی زبانیں اپناتے جا رہے ہیں۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی اشد ضرورت ہے ورنہ غریب ملکوں کی زبانیں ختم ہوتی جائیں گی۔

پنجابی، پاکستان کی سب سے بڑی، اور دنیا میں اس وقت بولی جانے والی سات ہزار زبانوں میں سے بیسویں سب سے بڑی زبان ہے۔ یہ نہ صرف ہندوستان، آسٹریلیا، انگلستان، مشرق وسطیٰ، فرانس، امریکہ اور دیگر کئی ملکوں میں بولی جاتی ہے بلکہ کینیڈا میں بولی جانے والی یہ پانچویں بڑی زبان ہے۔ کروڑوں لوگوں کی یہ صدیوں پرانی زبان، جو ہماری ماں بولی ہے، بہت وسیع، سود مند اور بڑھیا زبان ہے، کیا ہم اسے خود اپنے ہی ہاتھوں مار ڈالیں گے؟

پنجاب کے دل، شہر لاہور میں کوئی شخص دھوتی کُرتا پہنے دکھائی دے تو عجیب لگتا ہے، کوئی کھسہ اور پگڑی باندھے نظر آئے تو عجیب لگتا ہے۔ کوئی دانشور، علم و ادب کے کسی موضوع پر پنجابی زبان میں گفتگو کر رہا ہو تو عجیب لگتا ہے۔ یہ عجیب لگنا ہی عجیب سی بات ہے لیکن نجانے کیوں یہ عجیب معلوم نہیں ہوتی؟ اور بھی کافی عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر عورتوں کو چھاتی کے سرطان سے آگاہ رکھنے کے لیے مختلف اشتہار چلتے ہیں کہ اس کا باقاعدگی سے چیک اپ کرواتے رہنا چاہیے۔ عوام الناس کی معلومات کے لیے اس طرح کے اشتہارات دکھانا بہت اچھی بات ہے۔ یہ اشتہار ہماری قومی زبان اردو میں بھی دکھایا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ بات سمجھ سکیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے لیکن یہی اشتہار، پنجاب میں، پنجابی زبان میں نہیں چل سکتا۔ اگر چلا، تو ہر طرف پنجابی لوگ ایک شور ڈال دیں گے کہ بھئی ٹیلی ویژن پر گندی بات کر کے فحاشی پھیلائی جا رہی ہے، کیونکہ پنجابی میں چھاتی کے لئے لفظ ممّا استعمال کیا جاتا ہے اور ممّا ایک گندا اور فحش لفظ ہے۔ گندی بات؟ فحاشی؟ کیوں بھئی؟ اگر یہی بات اردو یا انگریزی میں کرتے ہوئے صاف اور معلوماتی ہو سکتی ہے تو پنجابی میں فحش کیونکر ہو جاتی ہے؟

یہ ہماری زبان کا نہیں، ہمارا اپنا گھٹیا پن ہے کہ ہم نے اپنی ماں بولی کو ایک گندی بولی بنا دیا ہے۔ چھاتی یا پستان کے لئے پنجابی میں لفظ ممّا استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں تک پنجابی لفظ 'ممّے' کے مطلب کا تعلق ہے تو یہ لفظ بہت پاکیزہ اور مقدس ہے۔ لفظ ممّا ایک ماں اور بچے کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ پیدا ہوتے ہی بچے اپنی ماؤں کے مموں سے ہی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ یہ لفظ ماں اور بچے کے پاکیزہ رشتے کا عکاس ہے۔ اسی لفظ سے ہمارے دو جانے پہچانے لفظ نکلے ہیں۔ ایک 'ماں' اور دوسرا 'مامتا'۔ ہماری ماں بولی کا یہ لفظ جو ہمیں ماں اور بچے کے پاکیزہ رشتے کی یاد دلاتا ہے ہم نے اسے گندہ اور فحش بنا دیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک جنگل میں ایک لومڑ رہتا تھا۔ ایک روز سحر کے وقت وہ اپنے غار سے باہر آیا۔ ساری رات مست ہو کر سونے کی وجہ سے خاصا تازہ دم تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں سانس لیا اور خوش ہو گیا۔ مزے سے ٹہلتے ہوئے شکار کی تلاش میں پھرنے لگا۔ شکار تو نہ ملا سورج نکل آیا اور اس نے اپنا سایہ زمین پر دیکھا تو خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ خود سے کہنے لگا بھئی میں تو بہت بڑا ہوں، میرا شکار تو کم از کم ایک ہاتھی ہونا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے ہاتھی کی تلاش شروع کر دی۔ کافی دیر ڈھونڈنے پر بھی

ہاتھی نہ مل سکا۔ اتنے میں سورج کچھ بلند ہو گیا۔ اب جب اس نے اپنا سایہ دیکھا تو پہلے سے قدرے چھوٹا تھا۔ سوچنے لگا کہ ہاتھی کی ضرورت نہیں میرا پیٹ بیل سے بھی بھر ہی جائے گا۔ اب اس نے بیل کی تلاش شروع کر دی۔ کچھ دیر اور گزری اور جب سورج اور بلند ہو گیا تو اس کا سایہ مزید چھوٹا ہو گیا۔ اب وہ تھک بھی چکا تھا اور بھوک بھی لگ چکی تھی۔ خود سے کہنے لگا کہ پیٹ بکری سے بھی بھر جائے گا۔ بکری بھی نہ ملی اور سورج بھی عین سر پر آ گیا، اب کی بار اس کا سایہ بھی بالکل چھوٹا تھا۔ کچھ دیر اپنی پرچھائی کو دیکھ کر کہنے لگا میرا خیال ہے آج خرگوش سے ہی کام چلا لیا جائے۔

یہی کارپوریٹ کلچر، جو سرمایہ دارانہ نظام کا نیا آسیب ہے اور ہمیں سحر کا لومڑ بنا چکا ہے۔ ہمیں پاگل بنانے کے لیے ہماری پرچھائی بہت بڑی کر کے دکھاتا ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم بہت بڑے ہیں، ہمیں جو اپنا آپ دکھائی دیتا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ ہم اصل میں بہت عظیم ہیں اور ہماری منزل بہت دور۔ ہم آسمان کو چھونے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور اگر ہم آسمان کو چھو نہ پائے تو ہماری زندگی بے کار جائے گی۔ آسمان کو چھوؤ، چھلانگیں مارو یہ کہہ کر ہمارا دماغ اس کارپوریٹ کلچر نے خراب کر ڈالا ہے۔

سحری کے لومڑ کی طرح ہمیں لگتا ہے کہ ہم بہت عظیم ہیں اگر ہم نے آسمانوں کو مسخر نہیں کیا تو ہماری زندگی بے کار جائے گی۔

پھر یہ سرمایہ دارانہ نظام کا آسیب ہمیں بتاتا ہے کہ آسمان سے مراد کامیابی ہے اور کامیابی کا معیار دولت ہے۔ اسی طرح بچپن سے یہ گردان سن سن کر ہماری زندگی کا واحد مقصد دولت کے انبار اکٹھے کرنا ہی رہ جاتا ہے۔ بچپن سے ہی ہمارے ذہن میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ اگر ہم کامیاب نہ ہوئے تو ہمارا وجود ہی بیکار ہے۔ کیریئر میں کامیابی کا معیار دولت کے ڈھیروں انبار پر ہے۔ یہ اندھیرا ہمیں چاروں طرف سے شام سویرے اس طرح گھیرے ہوئے ہے کہ ہماری عقل کا سورج کبھی بھی اوپر آ کر ہمیں ہماری اوقات نہیں دکھا سکتا۔

ہم ساری عمر یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہماری زندگی کا واحد مقصد دولت کمانا ہے۔ اگر ہم دولت کماتے ہیں تو ہم کامیاب ہیں ورنہ ناکام اور یوں ہمارے وجود کی قیمت ہمارے کیریئر کے ساتھ جڑ جاتی ہے۔ زندگی کی یہ تصویر ہمارا بیڑا غرق کر کے رکھ دیتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام دولت کے حصول کے چکر میں ہمیں اس موت کے کنویں میں دھکیل کر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی ضرورت ہے کہ لوگ اس نظام میں ایک پرزے کی طرح دن رات کام کرتے رہیں۔ یہ بے رحم نظام چاہتا ہے کہ لوگ انسان نہیں بلکہ مشین کے پرزے بن جائیں۔ ان کی زندگی پیسہ کمانے اور کام کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ رہے۔ نہ شوق، نہ رشتے، نہ فن، نہ ادب، نہ علم برائے علم کی طلب، نہ سماجی رابطے اور نہ ہی کچھ اور۔ صرف کام اور کام بھی وہ جس میں دولت کمائی جاسکے اور کس کام میں دولت کمائی جاسکتی ہے، یہ فیصلہ نظام کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی چکی میں پس کر سارا سماج کنویں کے مینڈک کی طرح دولت کی ایک دوڑ میں لگا رہتا ہے جب تک کہ قبر کی مٹی اسے اپنی لپیٹ میں لے نہیں لیتی۔

ساتھ میں ہمیں یہ بھی باور کروایا جاتا ہے کہ ہم ہیں بھی تنہا اور جو کچھ بھی کرنا ہے ہم نے ہی کرنا ہے اور وہ بھی فوراً۔ ہم کسی بڑی لہر کا حصہ نہیں ہو سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے حصے کی شمع جلائیں اور آنے والے اپنے حصے کی، اور اس طرح ایک بڑا الاؤ روشن ہو جائے جس سے ایک بڑا مقصد حاصل کیا جاسکے۔ پہلے تو ہمارا مقصد ہی صرف ایک ہے، دولت کمانا۔ اس لیے کسی اور مقصد پر شمعیں جلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ مقصد حاصل کرنے کے لیے بھی آپ کے پاس مہلت صرف آپ کی زندگی تک ہی ہے تو اگر آپ مرنے سے پہلے دولت کا انبار

اکٹھا کر لیں تو آپ کی زندگی کامیاب ہے، وگرنہ آپ بے موت ہی مر گئے۔

جب زندگی کی ایسی تصویر کے ساتھ زندگی کو گزارا جائے گا تو کون احمق ہو گا جو مروجہ زبان کو چھوڑ کر ماں بولی کے پیچھے جائے گا؟ جو زبان پڑھ لکھ اور بول کر دولت کمائی جا سکے وہی کام کی زبان ہو گی، باقی سب بیکار ہو جائیں گی۔ آج مغربی پنجاب میں کام کی زبان صرف انگریزی بن چکی ہے۔ بے دولتی پنجابی اب کون بولے؟ ہم خود بھی انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں اور بچوں کو بھی یہی سکھاتے ہیں۔ بات وہیں آ کر رکتی ہے کہ جب ساری زندگی دولت کے پیچھے ہی بھاگنا ہے تو پھر کیسی ماں اور کیسی بولی؟ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ دنیا سرمایہ داروں کی مرضی سے نہیں چلتی۔ موت اگر ہماری ہے تو زندگی بھی ہماری ہی ہے۔ زندگی اگر ہماری اپنی مرضی سے نہیں گزرنی تو گزرے یا نہ گزرے، ایک برابر ہے۔ جب بادشاہت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی تو وقت بھی ایک سا نہیں رہتا۔ یہی زندگی کا اصول ہے کہ سامنے نظر آنے والے حالات کچھ اور ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر مستقبل کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ جب سارے طوطے کی مانند ایک ہی رٹ لگاتے ہیں کہ انگریزی سیکھو انگریزی سیکھو تو مجھے رومی کی ایک کہانی یاد آ جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص ایک پیر کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کو حیوانوں کی زبان آتی ہے یہ زبان مجھے بھی سکھا دیں۔ پیر نے کہا کہ یہ بڑی باتیں ہیں، تمہارا اتنا ظرف نہیں تم برداشت نہیں کرپاؤ گے لیکن وہ نہ مانا اور جانوروں کی بولی سیکھ لی۔ یہی شخص صبح سویرے اپنے گھر کے دالان میں کھڑا تھا۔ غلام نے ایک باسی روٹی کا ٹکڑا باہر پھینکا۔ ایک کتا اس ٹکڑے کی طرف لپکا مگر پاس بیٹھے مرغے نے وہ روٹی کا ٹکڑا اچک لیا اور دیوار پر جا بیٹھا۔ کتے نے مرغے کی منت کی کہ وہ رات سے بھوکا ہے، وہ روٹی اسے دے دے۔ مرغے نے کہا وہ خود رات سے بھوکا ہے لیکن کتا فکر نہ کرے، آج مالک کا اونٹ مر جائے گا اور کتے کو وافر گوشت مل جائے گا۔ کتا یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ بندہ جو جانوروں کی زبان سمجھ رہا تھا اس نے فوراً جا کر اپنا اونٹ فروخت کر ڈالا۔ اگلے دن اسی طرح مرغے نے کتے سے، مالک کا گھوڑا مر جانے کی بات کہی تو وہ شخص اپنا گھوڑا بیچ آیا۔ اگلے روز مرغے نے مالک کے نوکر کے مرنے کی پیش گوئی کتے سے کی تو وہ شخص اپنا غلام بھی بازار میں بیچ آیا۔ اب کتے نے مرغے سے کہا کہ وہ روزانہ جس کے مرنے کی بات کرتا ہے مالک اسے بیچ آتا ہے۔ مرغے نے جواب دیا کہ ان تینوں کی موت دراصل مالک کی جان کا صدقہ تھا، جو اس نے ٹال دیا ہے، اب یہ مالک خود ہی مر جائے گا۔ یہ سن کر اس شخص

کے ہوش اُڑ گئے اور وہ بھاگا بھاگا پیر کے پاس پہنچا اور التجا کی کہ مجھے بچایئے۔ پیر نے کہا اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ بہت بڑے ظرف کی بات ہے، وہ برداشت نہیں کر پائے گا۔ اب وہ صرف اس کے لیے مغفرت کی دعا ہی کر سکتا ہے۔

سو بہتر یہی ہے کہ فوراً دولت کمانے کے چکر میں ہم اس کم ظرف شخص کی طرح نہ ہو جائیں جو وقتی فائدے کے عوض اپنا نقصان کروا بیٹھا۔ ایسا نہ ہو کہ لالچ کے چکر میں ہم اپنی نسل کا نقصان کر جائیں۔ اردو انگریزی یا کوئی بھی اور زبان، جو کام کاج کے لیے ضروری اور فائدہ مند ہو وہ ضرور سیکھیں لیکن اپنی ماں بولی کو مرنے کے لیے نہ چھوڑ دیں۔

آزادی اچھی چیز ہے لیکن ہر چیز ہر وقت اچھی نہیں ہوتی۔ انتخاب کی آزادی اچھی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا کنزیومرازم نامی آسیب اس آزادی کو بڑھاوا دیتا رہتا ہے۔ آپ کے پاس ایک سے زائد اشیاء میں سے انتخاب کی سہولت ہونی چاہیے اور فیصلہ بھی آپ کا ہونا چاہیے کہ آپ ان میں سے کیا منتخب کرتے ہیں۔

یہ آسیب ہمیں رٹایا جارہا ہے کہ بھئی انتخاب کی آزادی ایک بڑی نعمت ہے۔ یہی تو زندگی کا اصل رنگ ہے۔ جب بھی میں یہ گردان سنتا ہوں مجھے اس روتی پیٹتی ماں کا انٹرویو یاد آجاتا ہے۔ گوری تھی، آسٹریلین۔ کچھ سال پہلے ان کے علاقے میں سیلاب آ

گیا۔ پورا گھر پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ اپنے دو بچوں کو پکڑے ہوئے ایک ستون کے سہارے کھڑی تھی کہ اچانک پانی کا ایک زوردار ریلا آیا۔ یہ ریلا اتنا زوردار تھا کہ وہ دونوں بچوں کو سنبھالے ستون کو تھام نہیں سکتی تھی لحظہ اسے اپنے ایک بچے کو چھوڑنا پڑا۔ اب کون سا بچہ وہ اپنے پاس رکھے اور کون سا چھوڑے، اس انتخاب کی اس کے پاس مکمل آزادی تھی۔ اپنا ایک بچہ بچانے کے لیے اسے اس کربناک آزادی کا استعمال کرنا پڑا۔

بہتر تو یہی ہے کہ اس طرح کی کربناک آزادی ہمیں اپنی زبان کے ساتھ نہ برتنی پڑے۔ ہم اپنی قومی زبانیں بھی سیکھیں اور بین الاقوامی بھی لیکن جب خواب دیکھیں اور خود سے ہمکلام ہوں تو اپنی ماں بولی میں ہوں اور جب کسی کو دیکھ کر دل بھر آئے اور بے اختیار آنسو نکل آئیں اس وقت بھی زبان سے ماں بولی ہی نکلے۔ خدا کرے!!!

2

ماں بولی

اسو(اسوج) اور کتے(کاتک) کا موسم، جسے اردو میں خزاں اور انگریزی میں فال کہتے ہیں، اتنا ہی خوبصورت ہوتا ہے جتنا چیتر اور وساکھ ہوتے ہیں، جنہیں اردو میں بہار اور انگریزی میں سپرنگ کہا جاتا ہے۔ سخت موسم تبدیل ہو جاتا ہے، درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے اور سورج کی تپش بھی کم ہو جاتی ہے۔ ہر چیز کا رنگ نکھر سا جاتا ہے۔ طبیعت میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے اور ہر چیز خوبصورت لگنے لگتی ہے۔

پنجاب میں یہ رواج ہے کہ جب بھی موسم بدلتا ہے ہم میلا سجا کر ناچتے گاتے ہیں۔ پنجاب کی روایات اس کی زمین سے جنم لیتی ہیں کیونکہ یہاں کے موسم، رُت، جانور، دریا سب اس مٹی سے

جڑے ہوئے ہیں۔

رسوم ورواج کے ساتھ ہمارے جذبات بھی پنجاب کی زمین کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور جذبات کا اظہار بھی۔ بچے کو تکلیف ہو تو ماں کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ جو کچھ بھی کہتی ہے وہی الفاظ اس بچے کا علاج کرتے ہیں۔ ہماری مائیں کہتی تھیں ہائے میں مر گئی، رب دیاں رکھاں اور خدا خیر کرے، کیونکہ میں نے اپنی ماں کو یہی کہتے سنا ہے اس لیے مجھے ماں اور بچے کی تکلیف کے لیے یہی جملے سب سے زیادہ اثر انگیز لگتے ہیں۔ یہ دوسری زبانوں سے بغض نہیں بلکہ اپنی ماں بولی کا اثر ہے جو مجھے میری ثقافت اور اپنی جڑوں کے ساتھ جوڑتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری ماں بولی، ہماری سوچ اور ہمارے سوچنے کے انداز پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ہم بات کرنے کے لیے ماں بولی اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ ہم سوچتے اسی میں ہیں۔ جس زبان میں ہم خود کلامی کرتے ہیں اسی میں سب سے بہتر اظہار کر سکتے ہیں۔ زبان بات اگلتی ہے، پیدا نہیں کرتی۔ بات پیدا انسان کے اندر ہوتی ہے۔ اندر گہرائی ہو تو بات بھی گہری ہو گی، چاہے زبان کوئی بھی ہو۔

میں نے پولش ناول رینبو، جرمن ناول سدھارتھ اور ہندوستانی ناول دلی پڑھے ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میں نے پولش ناول

انگریزی اور جرمن اور ہندوستانی ناول اردو میں پڑھ رکھے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے جب میں اپنی کتابیں دیکھ رہا تھا تو پتا چلا کہ میں نے روسی ناول پنجابی میں، جرمن ناول اردو میں اور ہندوستانی ناول انگریزی میں پڑھے تھے۔ یہ ناول اس قدر متاثر کن تھے کہ مجھے یہ یاد نہیں کہ کس زبان میں پڑھے تھے۔ زبان، بات کو خوبصورت بنا دیتی ہے، بڑھا نہیں سکتی۔ جس بولی / زبان میں ہم سوچتے ہیں اسی میں سب سے خوبصورت بات بھی کر سکتے ہیں اور سمجھ بھی سکتے ہیں۔ زبان خود نہیں بولتی، انسان بولتے ہیں۔ بولیاں / زبانیں بھی بولتے ہیں اور ماں بولی بھی۔ بولی بولتے ہیں تاکہ کام کر سکیں۔ لین دین، حساب کتاب اور ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ زبان انسانوں کی سوچ کو جوڑتی ہے اور ماں بولی، جذبات کو۔ لین دین اور حساب کتاب کسی بھی زبان میں ہو سکتا ہے لیکن دُکھ سُکھ صرف ماں بولی میں ہی ہوتا ہے۔ کسی کا دُکھ سُن کر رو پڑنا اور مذاق سن کر بے اختیار ہنس پڑنا صرف ماں بولی میں ہی ہوتا ہے۔ ماں بولی وہ بولی ہوتی ہے جس میں ماں ہمیں لوریاں سناتی ہے، روئیں تو چُپ کراوتی ہے، لاڈ کرتی ہے۔ یہ وہی زبان ہے جو ہماری مائیں نسلوں سے ہمیں گود میں اٹھائے ہمارے ساتھ بولتی تھیں۔ یہی زبان ہمیں دُنیا سے روشناس کراتی ہے۔ بتاتی ہے کہ دنیا کس طرح بنی، کس نے بنائی۔ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور مرنے کے بعد

کدھر جائیں گے؟ رشتے کیا ہوتے ہیں؟ بدی اور نیکی، اچھائی اور بُرائی کیا ہے؟ ماں بولی وہ عینک ہوتی ہے جس سے ہم زندگانی کو دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ ماں بولی رنگوں کی وہ بساط ہے جس سے ہم اپنی زندگی کے نقشے میں رنگ بھرتے ہیں۔

بڑے بزرگ جو زبان بچوں کے ساتھ بولتے ہیں جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں وہ بچے ساری زندگی نہیں بھول پاتے۔ میں تیسری جماعت میں تھا، ہم اسلام آباد میں رہتے تھے۔ سارا دن مے فیئر Mayfair کی چیونگم کھا کھا کر اس کے سٹیکر جمع کرتے رہتے تھے کہ ایک سے سو نمبر تک کے تمام سٹیکر جمع ہوں گے تو ایک ڈبہ مفت ملے گا۔ چونی کی چیونگم ہوتی تھی اور وہ ہر وقت ہمارے پاس نہ ہوتی، لیکن چیونگم کا مزہ اور مفت ڈبے کا لالچ ہمیں سکون نہ لینے دیتا تھا۔ ہر وقت اِدھر اُدھر سے چونیاں اٹھنیاں اکٹھی کر کے چیونگم لینے کے لیے بھاگ رہے ہوتے۔ ابا سرکاری ملازم تھے جو حرام کھاتے نہ تھے۔ چنانچہ ماروی روڈ پر رہتے ہوئے بھی ہم جناح سوپر مارکیٹ یا تو پیدل جاتے یا پھر مارکیٹ کی پچھلی طرف گاڑی کھڑی کر کے اندرونی راستوں پر پیدل دوسری طرف جایا کرتے۔ یہ اس لیے کہ گاڑی فالتو دو کلومیٹر نہ چلے اور پٹرول کی بچت ہو۔ اس پر بھی ہر وقت چیونگم چبانا یونہی تھا گویا "پلے نہیں دھیلا، کردی میلہ

میلہ" (جیب میں دھیلا نہیں اور چلے میلہ دیکھنے)۔ ایک دن تایا جی ڈاکٹر اجمل گھر آئے۔ بڑے بھی تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر بھی رہ چکے تھے۔ میری ماں نے میری شکایت ان سے کی کہ ایک تو نالائق ہے اور دوسرا اسکول کی کتابیں پڑھنے کے بجائے فضول کہانیاں پڑھتا رہتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو تو اپنے والدین ہی بڑے بڑے اور طاقتور نظر آتے ہیں اور یہ تھے تایا جی، میرے والدین کے بھی بڑے۔ مجھے تو یوں لگا کہ میں کسی دیو کے سامنے پیش کر دیا گیا ہوں۔ میں ڈانٹ سننے کے لیے تیار تھا لیکن تایا جی نے پوچھا کہ بیٹا کیا پڑھ رہے ہو آج کل؟ میں نے حیران ہو کر بتا دیا کہ اشتیاق احمد کے جاسوسی ناول اور عمرو عیار کی طلسم ہوشربا۔ اُسی وقت مجھے ساتھ لے کر ایف سکس 'کورڈ' مارکیٹ لے گئے اور طلسم ہوشربا کی دس جلدیں اور اشتیاق احمد کے چار جاسوسی ناول لے دیئے۔ اس سے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو میں نے سکول سے تین روز کی چھٹی کر کے، دن رات ایک کیے اور سات ناول مکمل پڑھ لیے اور دوسرا یہ کہ اس سے میرے پڑھنے کی رفتار ایسی بن گئی کہ پھر مجھے پڑھنے سے کبھی کوئی روک نہ پایا۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک بڑے بزرگ شخص، جن کی عزت میرے والدین بھی کرتے ہیں، میری اس عادت سے خوش ہیں

تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا۔ یہ صرف میرا اور میرے والدین کا اختلاف تھا جس میں ان کے بزرگوں نے میرا ساتھ دیا۔ پھر میں گرمیوں کی چھٹیوں میں ساری دوپہر بند سٹور میں رضائیوں کے اوپر بیٹھ کر ناول پڑھا کرتا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں نے ناولوں کے ساتھ تاریخ کی کتابیں بھی پڑھنا شروع کر دیں۔ بچپن میں تایا جی کا یہ باور کرانا کہ میری مطالعہ کی عادت انہیں اچھی لگی، میرے مطالعہ کی عادت کا سنگ بنیاد بن گیا۔

انسان چاہے جتنا مرضی بڑا کیوں نہ ہو جائے جو کچھ وہ بچپن میں سیکھ جاتا ہے وہ یا تو اس کے ذہن سے نکل نہیں پاتا یا اُس کو نکالنے کے لیے اسے خود سے جنگ لڑنا پڑتی ہے۔ کافی سال پہلے ایک دستاویزی فلم دیکھی تھی کہ گورے، مچھلیوں کے بچوں کو بیس روز دریا کے پانی میں رکھ کر سمندر میں چھوڑ دیتے ہیں۔ مچھلیاں اپنی ساری زندگی سمندر میں ہی گزارتی ہیں لیکن بچپن ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بچپن کے اُس دریائی پانی کی خوشبو انہیں ہر وقت بے چین رکھتی ہے اور وہ بڑی ہو کر اپنے بچپن کی تلاش میں سمندر کے اُسی کنارے پر پہنچ جاتی ہیں جہاں سائنس دانوں نے انہیں چھوڑا تھا۔

اسلام آباد میں ہماری گلی میں ایک خاندان رہتا تھا۔ والدین

اور ان کے تین بیٹے۔ چھوٹے دو بیٹے ہمارے بھی دوست تھے۔ بڑا
خوشحال گھرانہ تھا۔ پھر ہم لاہور آ گئے۔ دو سال بعد پتہ چلا کہ
سب سے چھوٹا بیٹا، جو اس وقت پانچویں جماعت میں تھا، عید والے
دن اپنی عیدی سے ہوٹل پر تیراکی کرنے گیا اور تالاب میں ڈوب
کر مر گیا۔ دو سال بعد اس کی ماں بھی اس کی یاد میں مر گئی۔
اپنی اولاد کو خود اپنے ہاتھوں سے دفنا کر اُسے کہاں چین مل سکتا
تھا۔ پھر سوچا ہو گا کہ خدا کے سب ناموں میں سے سب سے بڑا
نام "الصمد" ہی ہے تو اپنے بچے کے پاس چلی گئی کہ یا تو مل جائے
گا یا جان چھوٹ جائے گی۔ پھر ایک سال بعد خبر ملی کہ اُس کے
باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اُس وقت تو مجھے بہت غصہ آیا کہ
کتنا غلط کام کیا ہے مگر اب سمجھ آتی ہے کہ وہ غصہ میرا نہیں تھا
بلکہ گردونواح میں جو کچھ کہا جا رہا تھا میں بھی وہی محسوس کر رہا
تھا کہ انہوں نے کیا کیا؟ چھوٹا بیٹا مر گیا اور بیوی بھی چل بسی تو
اس کا حال تو اس یتیم بچے جیسا ہو گیا ہو گا جس کے ماں باپ چل
بسے ہوں۔ اپنے جوان بیٹے کا جنازہ اٹھانا پڑ جائے تو بڑی بڑی جنتوں
کا لالچ ختم ہو جاتا ہے۔ اچھا کیا جو زندگی کو جینا شروع کیا۔ نئی
کرنے کی ٹھانی۔ نئی ہوئی تو نہ ہو گی لیکن اب مجھے سمجھ آتا ہے کہ
یہ ان کا اظہار ہو گا کہ خدا کا سب سے عظیم نام ہے.... الصمد،
یعنی بے نیاز!!!

وہ چونی والی چیونگم، ایک سفید کاغذ میں لپٹی ہوا کرتی تھی۔

اب اسلام آباد کے بارے میں سوچتا ہوں تو بس دو ہی چیزیں ذہن میں آتی ہیں۔ سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی چیونگم اور سفید کفن میں لپٹا ہوا بیٹا۔ جس طرح کوئی مر جائے تو واپس نہیں آتا، اسی طرح ماں بولی مر جائے تو واپس نہیں آتی۔ پھر بچپن کی یادیں، چیونگم اور مرے ہوئے دوست۔ حساب کتاب تو دوسری زبانوں میں بھی ہو جاتا ہے، لیکن مرے ہوئے یار کا بین انسان کس زبان میں کرے؟

بڑی زبانیں سیکھنی ضرور چاہئیں یہ دنیا کے ساتھ رابطے کا ذریعہ ہیں۔ ویسے تو اب یہ مسئلہ بھی نہیں رہا۔ ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ، اگلے پانچ سات سالوں میں ہی چینی اور پنجابی، درمیان میں ایک ڈبیا رکھ کر اپنی اپنی زبان میں بولتے جائیں گے۔ یہ ڈبیا چینی کو پنجابی اور پنجابی کو چینی زبان میں تبدیل کرتی جائے گی۔ یہ کام شروع ہو بھی چکا ہے۔ گوگل ٹرانسلیٹر یہی کام کر رہا ہے۔ اب کتابیں بھی اسی طرح منٹوں سیکنڈوں میں ترجمہ ہو جایا کریں گی۔

پھر بھی ہمارے ہاں انگریزی کا کافی رواج ہے۔ جس کی انگریزی جتنی اچھی ہے وہ اتنا ہی لائق فائق سمجھا جاتا ہے۔ جس کو دیکھو، پنجابی چھوڑ کر، انگریزی سیکھنے چلا ہے اور انگریزی کام بھی آتی ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ جو چیز آج کام آ رہی ہے ہمیشہ آتی

رہے گی۔ جب بھیڑ بکرے قربانی کے لیے لائے جاتے ہیں تو خوب خاطر مدارت کی جاتی ہے۔ مہندی لگاتے ہیں، گھنگرو باندھتے اور اچھا کھلاتے پلاتے ہیں۔ وہ جانور بھی سوچتا ہو گا کہ یہ میرے بڑے سگے ہیں مگر جب اس کی گردن پر چھری رکھ دیتے ہیں تو سوچتا ہو گا کہ یہ میرے ساتھ آخر ہوا کیا ہے؟ بڑی زبانیں بھی ہمیں اسی طرح چارہ پانی دے کر ہماری ماں بولی کی گردن پر چھری پھیرنے کا کام کرتی ہیں۔

لیکن عقل بھی تو خود ہی کرنا پڑتی ہے، خود بخود نہیں آتی۔ اٹلی کے گرجا گھروں میں یسوع کے ساتھ بڑے دینی بزرگوں کے بُت بھی ہوتے تھے۔ ایک بڑا عقل مند شخص ایک بڑے بزرگ کا پیروکار تھا۔ وہ دس سال سے مسلسل ہر اتوار گرجا گھر جا کر اس بزرگ مجسمے کے آگے دعائیں کرتا کہ میری لاٹری نکال دیں۔ نہ لاٹری نکلی، نہ مریدی ختم ہوئی۔ ایک دن اس بُت میں جان پڑ گئی اور اس بزرگ نے مرید کے آگے ہاتھ جوڑے کہ میں تمہاری لاٹری نکال دوں گا خدارا پہلے لاٹری کے ٹکٹ تو خرید لو۔ اسی طرح یہ گورے بھی ہمارے بزرگ بنے بیٹھے ہیں۔ بجلی ایجاد کی، کمپیوٹر ایجاد کیا۔ پنجابی اور کئی دوسری زبانوں کے سوفٹ ویئر بنائے اور کمپیوٹر میں ڈال کے ہمارے سامنے رکھ دیئے، اگر ہم اب بھی اپنی ماں بولی کی طرف

نہ جائیں تو ہم میں اور سیانے بندر میں کیا فرق رہ جائے گا؟

سیانے بندر کی بھی ایک کہانی ہے۔ کہتے ہیں کہ دس ہزار بندروں کو سٹاک ایکسچینج پر بٹھا دیا جائے، اور دو بٹن دے دیئے جائیں، ایک بٹن ایک کمپنی کے شیئر خریدنے کے لیے اور دوسرا، دوسری کمپنی کے ، تو دیکھیں کیا ہوتا ہے ۔ یہ بندر بٹن دبائیں گے ۔ آدھے ایک بٹن اور آدھے دوسرا۔ یعنی آدھے بندروں کو فائدہ ہو گا اور آدھوں کو نقصان۔ نقصان والے بندر نکالتے جائیں اور باقیوں کو دوبارہ بٹن دبانے دیں تو پھر آدھے بندروں کو منافع ہو گا اور آدھے کو خسارہ۔ پھر نقصان والے بندر نکال دیئے جائیں تو اس طرح کرتے کرتے آخر میں ایک ہی بندر رہ جائے گا جس نے ہمیشہ منافع والا بٹن دبایا ہو گا۔ اب ہر انسان، اسی بندر کو ہیرو مان کر نظریات بنانے لگ جائے گا۔ ایک کہے گا کہ یہ بندر کیلے کھاتا تھا، اس لیے اتنا سیانا ہے۔ عقلمند ہونے کے لیے کیلے کھانے چاہئیں۔ دوسرا کہے گا کہ یہ بندر دُم کے ساتھ الٹا لٹکتا تھا اس لیے عقلمندی کے لیے اُلٹا لٹکنا چاہیئے۔ کوئی بھی شخص محنت کر کے کمائی کرنا نہیں چاہتا بلکہ ہر بندے کو دولت کے ڈھیروں انبار چاہئیں۔

ہم کام نہیں کرنا چاہتے۔ محنت نہیں کرنا چاہتے بس سیانے بندر کی طرح ہر کام فوراً اور بہترین چاہیے ہیں ۔ اس طرح نہ تو ہوتا

ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ مرے بغیر جنت نہیں ملا کرتی، ماں بولی کے
تحفظ کے لیے ہمیں ہی قدم اُٹھانا پڑے گا۔ صرف باتیں کرنے اور
دکھاوا کرنے سے کام نہیں ہو گا۔ ہم ماں بولی کو اس طرح لیتے
ہیں۔ جیسے بڑے بزرگ دولت کو لیا کرتے تھے۔ یعنی ہاتھ کا میل۔
آج ہاتھ سے نکل بھی گئی تو کوئی بات نہیں، کل دوبارہ آجائے گی۔
ماں بولی بولنی نہیں، پڑھنی نہیں، لکھنی نہیں، اس کی عزت نہیں
کرنی، پھر بھی مان رکھنا کہ یہ مرے گی نہیں ۔ یہ تو سراسر سیانے
بندر والی بات ہے۔

سنا ہے سٹیفن ہاکنگ نے کہا ہے کہ علم کی سب سے بڑی
دشمن جہالت نہیں، عقلمندی کا احساس ہے۔ اس بارے میں سقراط کی
ایک کہانی خاصی مشہور ہے۔ ایتھنز میں ایک بڑی دیوی تھی، جس
کے مندر میں ایک دیوداسی تھی جس سے کوئی بات پوچھتے تو وہ
دیوی سے پوچھ کر بتا دیتی تھی۔ سقراط کے ایک دوست نے دیوی
سے پوچھا کہ ایتھنز میں سب سے عقلمند کون ہے؟ دیوی نے جواب
دیا سقراط۔ دوست نے یہ بات سقراط کو بتائی تو وہ حیران ہوا۔ کہنے
لگا کہ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ میں تو بالکل عقلمند نہیں ہوں لیکن
دیوی بھی دیوی ہے، جھوٹ تو نہیں کہہ سکتی، پھر کیا بات ہے؟ اس
بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے سقراط ایتھنز کے ایک جانے مانے

دانشور کے پاس گیا۔ کچھ دیر اس سے بات کر کے سقراط کو یہ
اندازہ ہوا کہ یہ بھی میری طرح ہی ہے ، اسے بھی میری طرح کچھ خاص
عقل نہیں ہے ۔ اسی طرح دوسرے دانشور کے ساتھ بھی یہی معاملہ
ہوا۔ سقراط نے ایتھنز کے سارے دانشور چھان مارے اور سارے ہی
بے عقل نکلے۔ سقراط سوچ میں پڑ گیا اور اس کو یہ بات سمجھ میں
آئی کہ جس شخص کو اپنی کم علمی کا علم نہیں، دراصل سب سے بڑا
بے عقل تو وہ ہے۔ مجھے دیوی نے عقلمند اسی لیے کہا ہے کہ مجھے کم
از کم یہ اندازہ تو ہے کہ مجھے کچھ نہیں آتا۔ یہی حال آج کل ہر
پنجابی شخص کا ہے۔ وہ یہی سمجھے بیٹھا ہے کہ پنجابی زبان تو اس کے
گھر کی کھیتی ہے۔ پنجابی زبان تو اس کو آتی ہے، وہ پنجابی جو ہے
لیکن اگر اُسے کہو کہ پنجابی لکھ کر دکھاؤ تو کہیں گے کہ وہ تو ہمیں
آتی نہیں۔ ہم نے کبھی نہیں لکھی، پڑھنے کو کہو تو کہیں گے ہم نے
کبھی پڑھی نہیں۔ بولنے کو کہو تو کہیں گے کہ بولتے ہیں، نوکروں
کے ساتھ پنجابی میں ہی بات کرتے ہیں، البتہ آہستہ آہستہ انہیں اردو
سکھا رہے ہیں اور ایک ہی سانس میں یہ باور بھی کروائیں گے کہ وہ
پنجابی بولی اور ثقافت سے کتنا پیار کرتے ہیں۔

اے انمول ڈیلفی کی دیوی، تم ہمیں بہت یاد آتی ہو۔

3

پنجاب اور عورت

پنجاب پر بے شمار الزامات ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ پنجاب کے لوگ بے غیرت ہوتے ہیں، جب بھی پنجاب پر کسی نے حملہ کیا یہ لڑنے کی بجائے ان کے پاؤں پڑ گئے۔ کچھ لوگ پنجابیوں کو بے غیرت اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اپنی عورتوں کو گھر سے باہر بھیج کر کام کرواتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ پنجابی جاہل اور گنوار قوم ہے اور کوئی کہتا ہے کہ یہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ کسی قوم سے مقابلہ کر کے اپنا مقام بنا سکتے۔

یوں تو پنجاب کے مسائل بھی کافی زیادہ ہیں۔ نئی نسل پنجابی زبان بولنا ہی نہیں چاہتی، پڑھنا تو دور کی بات ہے اور اگر کوئی پڑھنا لکھنا چاہے بھی تو رسم الخط کا جھگڑا ہے۔ پنجاب میں کوئی پنجابی

نہیں رہتا، ہر کوئی دوسرے دیس سے آیا ہوا ہے، کوئی عرب سے آیا ہے تو کوئی ایران سے، یا پھر کسی اور علاقے سے۔ پنجاب کی دھرتی بھی تقسیم شدہ ہے۔ ایک حصہ بھارت کے پاس ہے، دوسرا پاکستان کے پاس اور پنجابی ساری دنیا میں بکھرے پڑے ہیں۔

مشرقی پنجاب تین صوبوں میں منقسم ہے، پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش۔ مغربی پنجاب میں کوئی بہاولپور کو نکالنا چاہتا ہے؛ اور کوئی سرائیکی بن کر علیحدہ ہونا چاہتا ہے۔ تیسرا پنجاب دنیا میں بکھرے ہوئے پنجابیوں کا ہے، کچھ کینیڈا، کچھ یورپ اور باقی ادھر اُدھر۔ پنجابی دوسرے ملکوں میں جا کر آباد ہو رہے ہیں تو یہ ایک گلوبل فینومنا ہے۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے، جہاں رزق کی فراوانی ہو، لوگ وہیں ہجرت کرتے ہیں، صرف پنجابی ہی نہیں، ساری دنیا کے لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر وہاں ہجرت کرتے ہیں جہاں کھانے اور کمانے کے مواقع بہتر ہوں لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ پنجاب میں کوئی پنجابی نہیں؟ پرانے وقتوں میں زرخیز زمین والا دیس سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا اور پنجاب کی زمین دنیا کی زرخیز ترین زمین ہے، اسی لیے ساری دُنیا سے لوگ یہاں آ کر بستے رہے ہیں، بعض حملہ آور ہو کر اور بعض ایسے ہی۔

ہر پنجابی کا شجرہ نسب اتنا بڑا ہے کہ پنجاب سے باہر تو نکل

ہی جاتا ہے۔ گجر کہتے ہیں کہ ہم جارجیا سے آئے ہیں، راجپوت اور جٹ کہتے ہیں کہ ہم وسطی ایشیا سے ہیں، مغلوں کے مطابق ان کا تعلق ازبکستان سے ہے۔ قریشی، علوی، نقوی وغیرہ خود کو عربی کہتے ہیں۔ کوئی اپنے اجداد کو ایران سے ملاتا ہے اور کوئی ترکی سے۔ کوئی کشمیری ہے اور کوئی افغانی۔ اگر میں ایک پگڑی لے کر یہ کہوں کہ یہ اس کے سر پر سجے گی جو خالص پنجابی ہو گا، تو پتا نہیں کتنی دیر مجھے وہ شخص تلاش کرنا پڑے، جس کی جڑیں خالصتاً پنجاب سے ہوں۔ کیا پنجاب اتنا ہی بُرا ہے کہ کوئی بھی خود کو پنجابی کہلوانا پسند نہیں کرتا؟

جینیٹکس سے یہ پتا چلتا ہے کہ بچے کی آدھی میراث باپ کی طرف سے آتی ہے اور آدھی ماں کی طرف سے۔ یعنی میرے آباء جب عرب کے ریگستانوں سے آکر اس زرخیز زمین پر بسے تو عربی اور پنجابی کے جینز کا ملاپ شروع ہوا۔ جب پہلے عربی شخص نے یہاں شادی کر لی تو اگلی نسل میں آدھے عربی جینز اور آدھے پنجابی جینز آ گئے۔ اس پچاس فیصد عربی جینز والے شخص نے جب یہاں شادی کی تو تیسری نسل والے بچے میں عربی جینز اپنے باپ سے بھی آدھے آئے یعنی پچیس فیصد۔ اس سے آگے چوتھی نسل میں یہ جینز رہ گئے ساڑھے بارہ فیصد اور پانچویں نسل میں سوا چھ

فیصد۔ تو میرے عرب سے آئے ہوئے خالص عربی باشندوں کی چھٹی نسل میں عربی جینز رہ گئے صرف تین فیصد لیکن آج بھی یہ تین فیصد عربی اور ستانوے فیصد پنجابی جینز والے صاحبان خود کو قریشی لکھواتے ہیں اور کہتے ہیں وہ عربی النسل ہیں۔ جبکہ نسلوں سے وہ پنجاب میں رہتے آئے ہیں، یہیں کا نمک کھا کر اسی پنجاب کو گالیاں دیتے ہیں، کہتے ہیں پنجابی جاہل ہیں، گنوار ہیں۔

دھوتی کُرتا شہر میں کیا، دیہات میں بھی نظر نہیں آتا۔ ساگ، مِسی روٹی اور چاٹی کی لسی نہ تو گھروں میں بنتی ہے اور نہ ہی کسی ہوٹل پر ملتی ہے۔ سکولوں میں نوٹس جاری کیے جاتے ہیں کہ اگر کوئی بچہ پنجابی بولتے ہوئے پایا گیا تو اسے سکول سے نکال دیا جائے گا۔ یہ مغربی پنجاب کی بات ہے۔ لوگ پنجابی ثقافت کو اس لیے چھوڑ رہے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک پنجابی قوم میں عقل اور غیرت نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ گنوار ہیں، ثقافت گھٹیا ہے۔ دنیا کی ہر دھرتی کا کھانا فاسٹ فوڈ، پہناوا ولایتی فیشن اور مادری بولی انٹرنیشنل زبان کے ہاتھوں ہار رہے ہیں لیکن پنجاب میں خود پنجابی ہی اپنی ثقافت کو گھٹیا مان کر ترک کر رہے ہیں۔

زبان کو ہی لیجیے، صوفیا اور گروؤں کی زبان کو پنجابی خود ہی جہلا کی زبان کہتے ہیں کہ اس میں کوئی اعلیٰ بات نہیں ہو سکتی۔

جب کسی علم کے بارے میں پنجابی زبان میں بات ہی نہیں کرے گا، تو اس میں علمی بات ہو گی کس طرح؟ جس چیز کے لیے زبان کا استعمال ہی نہیں کریں گے، اس چیز کے لیے زبان تو بے کار ہو جائے گی اور اگر ہر چیز کے لیے ہی کسی زبان کا استعمال چھوڑ دیں گے تو زبان تو مر جائے گی۔ زبان اور ثقافت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک تاریخی عمارت کو چھوڑ دیتے ہیں اور برسوں بعد ہمیں خیال آئے کہ یہ عمارت تو ہمارے لیے بڑی دولت ہے، تو کچھ نہیں بگڑے گا، وہ عمارت وہیں موجود ہو گی، بس اس کی حالت خراب ہو چکی ہو گی۔ اسے رنگ و روغن کر کے دوبارہ بہتر بنا سکتے ہیں، لیکن یہی سلوک ہم زبان کے ساتھ کریں تو بیڑا ہی غرق ہو سکتا ہے۔ پچاس سال تو کیا، اگر ہم پانچ برس ہی زبان بولنا چھوڑ دیں گے تو یہ ختم ہو جائے گی اور اگر زبان ایک مرتبہ مر جائے تو دوبارہ زندہ نہیں ہوتی۔ زبان کی موت کے ساتھ، صرف بولی ہی نہیں مرتی، بلکہ تاریخ اور ثقافت بھی مر جاتے ہیں۔ آج اگر میں مغربی پنجاب میں کالج کے بچوں سے شیکسپیئر، نپولین اور 'کُو کلکس کلیَن' کے بارے میں پوچھوں تو بے شک وہ زیادہ نہ جانتے ہوں، انہوں نے ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ سنا ضرور ہو گا لیکن انہی بچوں سے اگر میں ہری سنگھ نلوا، دُلا بھٹی، استاد دامن اور بھنگی مِسل کے بارے میں پوچھوں تو وہ پریشان ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ

نام کبھی نہیں سنے ہوں گے۔ اسی طرح اگر میں ان سے اہرامِ مصر اور ہڑپہ کے بارے میں پوچھوں تو وہ اہرام مصر کے بارے میں دس باتیں جانتے ہوں گے اور ہڑپہ کے بارے میں صرف دو، جن میں سے ایک یقیناغلط ہو گی۔ زبان سے دوری، ہمیں ہمارے ماضی سے بھی دور کر دیتی ہے۔ اپنی تاریخ بھول جانے کا مطلب، اپنی بنیاد بھول جاناہے، اپنی جڑیں بھول جاناہے۔

اپنی ثقافت، اپنی تاریخ اور اپنی پنجابی زبان، نئی نسل اس لیے چھوڑتی جارہی ہے، کیوں انہیں معلوم ہی نہیں کہ ان کے ہر ایک خلیے میں نناوے فیصد جینز پنجابی ہیں، اور نہ ہی یہ علم ہے کہ دنیا کی سب سے پرانی تہذیب کے موجد ان کے پنجابی آباء ہیں۔ انہیں یہ اس لیے معلوم نہیں کیونکہ نہ تو ہم اس معیاپر پورے اتر سکتے ہیں کہ وہ ہم پر فخر کر سکیں اور نہ ہی ہم اپنے قابلِ فخر آباؤ اجداد کے بارے میں انہیں صحیح طرح کچھ بتاپاتے ہیں۔ امریکا کی سب سے پرانی تہذیب 'اولمک' کہلائی جاتی ہے، اور یہ 1500 قبل مسیح میں شروع ہوئی، یعنی آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے۔ عراقیوں نے بابل کا شہر 2300 قبل مسیح یعنی آج سے سوا چار ہزار برس پہلے بنایا۔ مصر میں پہلا اہرام 2700ق-م یعنی ساڑھے چار ہزار برس پہلے بنا اور ہمارے پنجاب کی ہڑپہ والی تہذیب مہر گڑھ

کے دو منزلہ گھروں والی آبادیوں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ آبادیاں 7000ق-م یعنی آج سے نو ہزار برس پہلے موجود تھیں اور 2600 ق-م میں ہڑپہ اور موہنجو داڑو کے شہروں کی تعمیر کے ساتھ یہ دنیا کی سب سے قدیم، اپنے وقت کی سب سے بڑی اور سب سے ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ یہ شہر آج سے تقریباً ساڑھے چار پانچ ہزار برس پہلے پنجاب کی سرزمین پر پنجابیوں نے بنائے تھے۔ کہیں سے نقل نہیں کیے تھے، کسی سے مدد نہیں لی تھی، خود سوچ اور خود ہی بنائے تھے۔ اس زمانے میں یورپ کے لوگ کچی جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور تہذیب سے کوسوں دور تھے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڑپہ کی تہذیب میں 2500 قبل مسیح میں لوگ ترقی یافتہ شہروں میں رہتے تھے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم بہت پرانے زمانے کی بات کر رہے ہیں اور یہ کتنے پرانے زمانے کی بات ہے یہ اندازہ کرنے کے لیے آیئے ہم تاریخ کے کچھ بڑے واقعات گنتے ہیں۔

دورِ حاضر کے بڑے واقعات میں 9/11، ہیروشیما اور ناگا ساکی پر ایٹمی حملہ اور کمپیوٹر کی ایجاد وغیرہ شامل ہیں۔ آج سے پانچ سو برس قبل، یعنی 1500 عیسوی کے لگ بھگ، 1526ء میں بابر نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ 1492ء میں فرڈینڈ اور

ازابیلا نے غرناطہ فتح کر کے اُندلس میں مسلمانوں کا دورِ حکومت ختم کر دیا تھا۔ 1492ء میں ہی ملک اندلس کے ایک جہازران کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا اور 1453ء میں ترکی میں سلطنتِ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سے بھی پانچ سو برس پہلے 1000ء کے لگ بھگ، ہندوستان میں محمود غزنوی حملے کر رہا تھا، انگلستان میں نورمن حملہ کر کے قابض ہو چکے تھے۔ اُندلس میں ابن الہیثم علم و فلسفے کی دنیا میں انقلاب لا رہا تھا۔ اس سے پانچ سو سال پہلے، تقریباً 500ء میں ہندوستان میں وسطی ایشیا کے جنگلی قبائل حملہ کر رہے تھے۔ 537ء میں رومن شہنشاہ نے استنبول میں ہایا سوفیا کا چرچ بنوایا، جسے بعد میں عثمانیوں نے مسجد بنا لیا، اور آج کل وہ ایک میوزیم بنا ہوا ہے۔

عرب میں اسلام کا ظہور 610ء میں ہوا۔ اس سے پانچ سو برس قبل صفر عیسوی میں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ 70ء میں رومیوں نے فلسطین پر حملہ کر کے یہودیوں کا دوسرا ہیکل سلیمانی تباہ کر دیا۔ چین کے مغربی سرحدی علاقے کے یوچی قبائل، ہندوستان پر حملہ کر کے کشان سلطنت کے بنیاد رکھ رہے تھے اور اس سے بھی پانچ صدیاں پہلے، پانچ سو قبل مسیح میں، یونان میں سقراط نے علم کی خاطر زہر کا پیالہ پیا۔ سقراط کا شاگرد افلاطون اور اس کا شاگرد ارسطو تھا۔ ارسطو کے شاگرد سکندر اعظم نے 326ق-م میں پنجاب پر حملہ کیا۔ پانچ سو قبل مسیح کے زمانے میں مہاتما بدھ ہندوستان

میں بدھ مت کا پرچار کرتے تھے۔ چین میں کنفیو شیئس اور لاؤزو علم و فلسفہ کی روشنی پھیلا رہے تھے اور ایران سے کورش اعظم اور دارا پنجاب پر حملہ کر رہے تھے۔

1000 قبل مسیح کے دور میں اسرائیل میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت تھی، چین میں ژُو سلطنت کا عروج تھا اور 1500 قبل مسیح میں، آریا ہندوستان آ چکے تھے۔ پنجاب میں ہندو مت کی بنیاد رکھی جا چکی تھی اور ہندو مت کی سب سے پہلی کتاب رگ وید پنجاب ہی میں لکھی جا رہی تھی۔ ایران میں زرتشت اپنے گاتھا لکھ رہا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، اپنے عصا سے بحر احمر کے دو ٹکڑے کر کے اپنی قوم کو صحرائے سینا لے آئے تھے۔ اس سے پانچ سو برس قبل 2000 ق-م کا زمانہ، یہودیوں کے مطابق وہ زمانہ ہے جب بائیبل کے خدا 'یاہوے' نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ وہ عراق کا علاقہ اُر چھوڑ کر کنعان یعنی فلسطین چلے جائیں، اور 'یاہوے' نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ فلسطین ان کا اور ان کی آل کا ہے۔ اپنی بندگی کی نشانی کے طور پر 'یاہوے' نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی نسل کے ہر لڑکے کا ختنہ کرنے کا حکم دیا تھا اور اس سے پانچ صدیاں پہلے 2500 ق-م میں وادیٔ سندھ کی سرزمین میں آج کے مغربی پنجاب میں ہڑپہ

اور آج کے سندھ میں مہنجوڈارو کے عظیم شہر اپنے عروج پر تھے۔

اس اتنی طویل بات کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنے پنجاب کی تہذیب کی قدامت کا درست اندازہ لگا سکیں کہ ہماری تہذیب سے قبل دُنیا میں کہیں بھی تہذیب کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پنجاب دنیا کو، نسل انسانی کو تہذیب سکھانے والی سب سے پہلی سرزمین ہے اور اس کی تہذیب، علم و ثقافت اور فن، اپنے وقت میں دنیا پر اپنی دھاک بٹھائے ہوئے تھے۔

ہڑپہ کی تہذیب میں علم و فن اپنے عروج پر تھا۔ یہاں جب میں عروج کہہ رہا ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ دنیا میں سب سے بہترین۔ ہڑپہ کی اشیاء کی دنیا میں اتنی مانگ تھی کہ یہاں سے بے شمار چیزیں مصر اور بابل (عراق) جاتی تھیں اور وہاں ہاتھوں ہاتھ بکتی تھیں۔ وہاں ہماری تہذیب کی بہت قدر اور عزت کی جاتی تھی۔ یہ بات بھی نہیں کہ ساری دنیا جانوروں کی طرح رہا کرتی تھی جبکہ پنجاب میں آئن سٹائن اور ڈاکٹر عبدالسلام پیدا ہوتے تھے۔ دنیا کی پہلی تین تہذیبیں، دریائے نیل کی مصر کی تہذیب، دجلہ و فرات کی بابل و نینوا کی تہذیب اور دریائے سندھ کی ہڑپہ کی تہذیب، ان سب نے آگے پیچھے ہی جنم لیا لیکن یہاں دو باتیں اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ تاریخ میں عام طور پر بڑی آسانی سے آگے پیچھے کہہ دیا جاتا

ہے جس طرح یہ دو چار روز کی بات ہو مگر جہاں تک تعلق ان تہذیبوں کے آگے پیچھے ہونے کا ہے تو اس سے مراد دو تین صدیاں ہیں۔ اس لیے بے شک ہڑپہ کی تہذیب کے وقت مصر و عراق اور بابل کی تہذیبیں اپنے عروج پر تھیں، لیکن ہمارا تاریخ میں ذرا پہلے ہونے کا مطلب ہے کہ ہم دو تین سو سال قبل ہی تہذیب یافتہ ہو چکے تھے۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں۔ اب اگر دو صدیوں کے فرق کا اندازہ کرنا ہو تو یہ بہت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ آج سے دو سو سال پہلے نہ کمپیوٹر تھے، نہ فون، نہ بجلی، نہ کاریں اور نہ ہی بال پوائنٹ۔ کسی بھی زمانے میں ایک قوم کا اپنے علم و ثقافت میں باقی دنیا سے دو سو سال آگے ہونا ایک کمال بات ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہڑپہ کی تہذیب دنیا کی اکیلی سب سے بہتر تہذیب نہ تھی۔ ہر چیز سب سے پہلی نہیں تھی۔ ہر چیز سب سے بہتر نہیں تھی اور یہ بھی نہیں کہ دنیا کی ہر تہذیب نے ہڑپہ کی تہذیب سے ہی سب کچھ سیکھا ہے لیکن دنیا کے دو سو سے زائد ممالک میں سے صرف تین ملکوں نے اپنی تہذیب شروع کی، اور اتنی ترقی کی کہ اس کے بعد صدیوں تک کوئی اور قوم ان کے مقابل نہ آ سکی۔ ان تین ملکوں میں سے ایک ہمارا پنجاب ہے ۔ یہ پنجاب کی سرزمین کا کمال ہے، جسے آج ہم بھلا چکے ہیں۔

اس بات پر ہمیں فخر بھی ہونا چاہیے اور شرمندگی بھی۔ فخر اس لیے کہ ہم اُسی عظیم سرزمین کے سپوت ہیں جو دُنیا میں سب سے پہلی تہذیب کے موجد ہیں اور شرم اس لیے کہ ایسے آباء کی اولاد ہو کر بھی آج ہم کس قدر پسماندہ اور جاہل ہو چکے ہیں۔

ساڑھے چار ہزار سال قبل ہڑپہ کے ساتھ ساتھ بابل اور مصر کی تہذیبیں بھی اپنے اپنے عروج پر تھیں لیکن ہڑپہ کی تہذیب اتنی بڑی تھی کہ یہ دونوں تہذیبیں مل کر بھی اس کے مقابل نہ تھیں۔ ہڑپہ تہذیب کے کم از کم ستر شہر تھے جو پانچ لاکھ مربع میل کے علاقے پر پھیلے ہوئے تھے۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو ساڑھے چار ہزار سال پہلے نیویارک اور پیرس تھے۔ چالیس چالیس ہزار آبادی کے یہ شہر، دنیا کے سب سے نفیس شہر تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ہزاروں لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے اور جہاں دل کیا اپنی اپنی جھونپڑی بنا ڈالی، بلکہ یہ شہر ایک منظم نقشے کے تحت بنے ہوئے تھے، کشادہ اور سیدھی سڑکیں، کمرشل اور رہائشی علاقے، قبرستان، گودام، ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر ایک مرتب کردہ نظام کے تحت بنائی گئی تھی۔ گھروں میں کنویں ہوتے تھے اور ہر گھر میں نکاسی آب کا نظام موجود تھا۔ نکاسی کی نالیاں گھروں سے باہر اینٹوں کی مربوط چھت سے ڈھکی ہوئی ہوتی تھیں۔ یہ نظام آج ہمارے گاؤں دیہات

میں نظر نہیں آتا جو ہمارے آباء واجداد نے ہزاروں برس پہلے
اپنایا ہوا تھا۔ اس پانچ لاکھ مربع میل کے علاقے میں تعمیر کے لیے
اینٹیں ایک ہی تناسب کی استعمال کی گئی تھیں۔ ہڑپہ نے اپنی ایک
نئی زبان بھی ایجاد کی تھی جو ہر نئی پرانی زبان سے مختلف تھی۔
کاروباری مال کی پہچان کے لیے خاص شکل کی مُہریں استعمال کی جاتی
تھیں اور ہر شکل کی مہر، اس کے مالک کا ایک خاص نشان ہوا کرتی
تھی۔ جیسے دور جدید میں ٹریڈ مارک کا نظام ہے۔ ہمارے اجداد اس
وقت بھی اپنے مردے دفن کرتے تھے اور مردے کے ساتھ روز
مرہ کی چیزیں دفن کی جاتی تھیں تاکہ اگلے جنم کے لیے بیدار ہوں
تو ضرورت کی چیزیں موجود ہوں۔

ہڑپہ کی تہذیب کی ایک خاص بات یہ تھی کہ یہاں کوئی
نظامِ بادشاہت نہیں ہوتا تھا۔ یہ کسی بھی اور تہذیب میں ممکن نہیں
تھا۔ ایک ترقی یافتہ اور بڑی تہذیب اور بادشاہت کے بغیر؟ لگتا ہے
کہ پنجابی لوگ ہزاروں سال پہلے بھی اتنے سمجھدار اور باشعور تھے
کہ انہیں اکٹھا کرنے کے لیے کسی سیاسی قوت کی ضرورت نہ تھی۔
ساری قوم باہم مل کر فیصلے کرتی اور صدیوں تک اتنی زیادہ ترقی
کرتی رہی۔ بادشاہ تو نہ تھے، لیکن پروہت ضرور تھے۔ پروہت تھے
اور خدا بھی، دیوی دیوتا بھی لیکن ان سب میں بڑھ کر ایک دیوی

تھی، دھرتی ماں کی دیوی۔

اس دیوی کے کولہے اور چھاتیاں تجریدی فن کے لیے بڑے نہیں بنائے جاتے تھے بلکہ جنسی بنانے کے لیے بنائے جاتے۔ جنس سے مراد اس وقت گندا کام نہیں بلکہ مقدس کام تھا۔ عورت کے ساتھ سونا اس کی عزت خراب کرنا نہ تھا بلکہ زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ایک نیا معصوم بچہ جننے کی خواہش کرنا تھا۔ دنیا کا سب سے مقدس کام تھا۔ سب سے بڑی عبادت تھی۔ ہندوؤں کا دیوتا شِوا، جس کا نشان یونی پر بنا لنگم ہے، وہ بھی ہڑپہ کا ہی دیوتا ہے ، جس کی مورتیں ہڑپہ کے کھنڈرات سے دریافت ہوئیں ہیں۔ جنسیت کا اظہار اس وقت مزے لینا یا بدمعاشی نہیں، بلکہ اس نعمت کا اظہار تھا کہ دھرتی ماں نے اسے اس قابل بنایا ہے کہ وہ زندگی کی بقا میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ یہ اظہارِ تشکر تھا کہ وہ صرف زندگی پانے والا نہیں بلکہ زندگی بخشنے والا بھی ہے۔ اس نے زندگی پائی ہے تو وہ زندگی آگے بھی دے گا، اپنے حصے کی زندگی کی قبر نہیں بن جائے گا۔ عورت کے بچہ جننے کی طاقت ایک نعمت سمجھی جاتی تھی اور بڑی چھاتیاں اور بڑے کولہے اس طاقت کا نشان تھے۔ دھرتی ماں کی مورت تھی دیوی، اور زندگی جننے کی طاقت کی مورت تھے بڑے کولہے، بڑی چھاتیاں اور بڑا لنگم ۔ یہ گندی چیزوں کی مورتیں نہ

تھیں بلکہ مقدس چیزوں کی مورتیں تھیں اور عورت پنجاب کی طاقت تھی، کمزوری نہیں۔ عورت، جانوروں کی طرح کسی کی جائیداد نہ تھی جسے کوئی اور چھین سکتا۔ عورت دھرتی ماں کی شبیہہ تھی، جو زندگی کو قائم رکھنے کے لیے خدا کی نعمت تھی۔ عورت قابل عزت تھی، ایک مقدس نعمت تھی ۔زندگی اور نسل انسانی کے لیے اتنی ہی ضروری تھی جتنا کہ مرد۔ عورت وہ کمزور عزت نہ تھی جسے چھپا کر رکھنا پڑتا۔ عورت فخر تھی، برابری تھی، کسی کی جائیداد نہیں، زندگی تھی۔ پنجاب کی عورت آزاد تھی۔ وہ پنجاب کی بیٹی تھی۔ اس کا عورت ہونا اس کی کمزوری نہ تھی۔ پنجاب کی بیٹی اپنی دھرتی کا مان تھی، فخر تھی۔ وہ اپنی زندگی جیا کرتی تھی، خوش ہوتی تھی، کام میں اپنا حصہ ڈالتی، ہاتھ بٹاتی تھی۔ پنجاب اُسے بُری نظر سے نہیں دیکھتا تھا، بلکہ اس کی قدر کرتا تھا۔ پنجاب کا مرد، کوئی جانور نہ تھا بلکہ ہر سانس کے ساتھ عبادت کرتا ہوا سادھو تھا۔

4

علم و ادب

پنجاب پر ایک اور الزام ہے کہ یہ جاہل اور گنوار لوگوں کی سرزمین ہے۔ سنسکرت کی کئی کتب میں پنجابیوں کو گنوار لکھا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ پنجاب کی زمین نے آج تک کوئی بڑا شخص پیدا نہیں کیا۔ پنجاب کے حکمران بھی ایک رنجیت سنگھ کے سوا سب باہر سے ہی آتے رہے اور نہ ہی کوئی عالی دماغ پنجابی رہا ہے۔ نہ فنکار، نہ سائنس دان، نہ لکھاری اور نہ کوئی دانشور وغیرہ۔ یہ بات بھی اسی لیے مشہور ہوئی کیونکہ انگریزوں کو سب سے زیادہ مشکل پنجاب کو فتح کرنے میں ہوئی۔ اس لیے انگریزوں نے تاریخ کو مسخ کر کے پنجابیوں کو انھی کی نظروں میں گرانے کی خاصی کوشش کی اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نوآبادیاتی دور کے پیمانوں پر ہی خود کو پرکھتے چلے آرہے ہیں۔

ویدوں کے زمانے میں پنجاب کا نام س پت سندھو تھا یعنی سات دریاؤں کی زمین۔ سنسکرت میں سندھو، دریاؤں کو کہتے ہیں۔ اس لیے دریائے سندھ کی وادی ایک ہی دھرتی تھی، پنجاب کی سات دریاؤں کی دھرتی ، جس میں سے رگ وید کا سب سے مقدس دریا سرسوتی اب سوکھ چکا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب باہر سے حملہ آور آتے گئے تو پنجاب کی زرخیز سرزمین دیکھ کر یہیں آباد ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ خیبر پختونخوا کے علاقے میں افغانوں کے، اور بلوچستان میں ایرانیوں کے قبائل آباد ہوتے گئے اور پنجاب کی سرزمین کے لوگوں کو پیچھے دھکیلتے گئے۔

یہ جاہل اور گنوار ہونے کا الزام بھی پنجاب پر علم کی کمی کی وجہ سے ہی لگایا جاتا ہے ، ورنہ قدیم دور سے لے کر اب تک پنجابیوں نے علم و ثقافت کے ہر میدان میں اپنا لوہا آپ منوایا ہے۔ ماضی سے کچھ ہی نام لیں تو بات ختم ہو جاتی ہے۔ بہت پرانے زمانے کے نام تو ہمیں نہیں معلوم، کیونکہ یہ لکھائی کی ایجاد سے بھی پہلے کی باتیں ہیں لیکن اس وقت کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ پنجابی علم و فنون میں کتنے قابل تھے۔

سون سکیسر 50,000 ق م

آثار قدیمہ کے کئی ماہرین کا خیال ہے کہ پنجاب کی وادی

سون سکیسر میں ایسے پتھر کے آلات دریافت ہوئے ہیں کہ جو دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں اور صرف پنجابیوں کی ایجاد ہیں۔ ان کے علاوہ بھی پتھر کے ایسے بہت سے آلات ملے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ پتھر کے زمانے سے پنجابی اذہان ترقی کی منازل طے کرتے آئے ہیں۔ کچھ ماہرین کا کہنا یہ بھی ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے زبان کا استعمال بھی یہیں کیا گیا تھا۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ انسان ہمیشہ اپنی بقا کے لیے زندگی کی لڑائی لڑتا ہے۔ عقل و دانش، غور و فکر، فن و حرفت کی باری اُسی وقت آتی ہے جب کھانے پینے کا انتظام پختہ ہو جاتا ہے۔ دنیا کی تہذیبیں وہیں پیدا ہوئیں جہاں اناج وافر تھا۔ پرانے زمانوں میں اناج، دریاؤں کی زرخیز وادیوں میں ہی وافر ہوتا تھا اس لیے دنیا کی سب سے پرانی تہذیبیں بھی انہی وادیوں میں پیدا ہوئیں۔ چاہے وہ دریائے نیل کی وادی ہو، بابل کی تہذیب یا پھر دریائے سندھ کی وادی ہڑپہ کی تہذیب۔ سون سکیسر میں پچاس ہزار سال پہلے کی ترقی اور ایجادات یہ گواہی دیتی ہیں کہ پنجابی ہمیشہ سے ہی کتنا زرخیز دماغ ہے اور سب سے پہلے زبان کا استعمال تو بہت بڑی بات ہے کیونکہ سائنس دانوں کے مطابق آج تک ہونے والی سب ایجادات میں سے سب سے بڑی ایجاد زبان ہی ہے۔

مہرگڑھ 7000ق م

مہرگڑھ جو اب صوبہ بلوچستان کا حصہ ہے، پرانے زمانے میں سات دریاؤں کی وادی کا حصہ تھا اور بعد ازاں مہرگڑھ کا علاقہ ہڑپہ کی تہذیب کا بھی حصہ رہا۔ اس علاقے میں دنیا کی سب سے قدیم تہذیبی ترقی کی دریافتیں ہوئیں ہیں۔ آج سے نو ہزار برس قبل، اس علاقے میں لوگوں نے گھر بنا کر رہنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ اس زمانے میں جب یورپ اور امریکہ میں لوگ غاروں میں رہتے اور جانوروں کی کھالیں پہنا کرتے تھے، پنجابیوں نے کھیتی باڑی شروع کر لی تھی اور اُونی کپڑا بھی ایجاد کر لیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ پنجابیوں نے سرکنڈوں کی ٹوکریاں بنانا بھی سیکھ لیا تھا اور مٹی کے برتنوں کو پکا کر پختہ بھی کر لیا کرتے تھے اور جس زمانے کی یہ بات ہے، اس وقت ہندوستان میں تو کیا، مصر اور بابل کے لوگوں کے لیے بھی یہ چیزیں عجوبہ تھیں۔

ہڑپہ 3000ق م

ہڑپہ کی تہذیب دُنیا کی سب سے قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ مصر اور بابل کی تہذیبوں میں بھی ہڑپہ کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ وہ لوگ پنجاب کے ساتھ تجارت کرتے تھے اور یہاں کی چیزیں انہیں بہت پسند تھیں جنہیں وہ خاصے مہنگے داموں خریدتے

تھے۔

یہ کوئی چھوٹی تہذیب نہ تھی بلکہ پانچ لاکھ مربع میل پر محیط تقریباً ستر شہروں کی تہذیب تھی۔ یہ سارے شہر ایک ہی تناسب کی اینٹ کے بنے ہوئے تھے اور ہر جگہ ناپ تول اور وزن کے لیے ایک ہی تناسب کے پیمانے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب کے بڑے شہر، جن میں ہڑپہ اور موہنجوڈارو آج کل مشہور ہیں، خاص طور پر ڈیزائن کیے گئے تھے۔ گھر کہاں بنائے جائیں، بازار کدھر ہوں، سڑکیں چوک، ہر ایک چیز سوچے سمجھے نقشے کے تحت بنائی گئی تھی۔ پورے کا پورا شہر نقشے کے تحت بسایا گیا تھا۔ سیورج کا نظام اتنا زبردست تھا کہ دنیا اگلے تین ہزار سالوں میں بھی ایسا نظام نکاس نہیں بنا سکی۔ ہر گھر میں پانی کا کنواں تھا اور نکاسی کے لیے نالیاں موجود تھیں۔ پنجابیوں نے اپنی لکھی زبان بھی ایجاد کی تھی جو آج تک ماہرین پڑھ نہیں سکے۔ یہ دنیا کی ایک انوکھی زبان ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔ یہ زبان اس طرح لکھی جاتی کہ صفحے پر پہلی سطر میں یہ دائیں سے بائیں لکھی جاتی اور پھر سطر ختم ہونے پر یہ بائیں سے دائیں لکھی جایا کرتی تھی۔ پنجاب کی ہڑپہ کی تہذیب دُنیا کی شاید سب سے پرانی اور سب سے بہترین تہذیب تھی۔

رگ وید 1500 ق م

رگ وید ہندو مت کی سب سے پرانی اور مقدس کتاب ہے۔
یہ پنجاب میں لکھی گئی تھی اس لیے اس میں دنیا کا سب سے بہترین
دیس پنجاب کو کہا گیا ہے اور سب سے مقدس دریا سرسوتی کو۔
ویسے تو رگ وید میں بہت سی باتیں پنجابیوں کے خلاف وسطی ایشیاء
کے آریاؤں نے لکھی ہیں، لیکن وہ جنگلی لوگ اس قابل نہیں تھے
کہ ایسی عقل و دانش کی باتیں لکھ پاتے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ
پنجاب کے کئی قبائل نے آریاؤں کے ساتھ جنگ کی لیکن کافی قبیلے
اور ذاتیں ایسی بھی تھیں جن سے آریاؤں کی لڑائی نہ ہوئی یا پھر
آریاء ان سے جیت نہ سکے۔ کیونکہ پنجاب بہت بڑا تھا اور دھرتی
نہایت زرخیز ، اوپر سے آبادی بھی بہت کم تھی اس لیے آریا اور پنجابی
مل جل کر رہنے لگ گئے اور آہستہ آہستہ ،پہلی کچھ صدیوں میں انہوں
نے آپس میں شادیاں بھی کیں۔ پنجابی اور آریاؤں کے ملاپ سے
ایک نئی نسل بن گئی جو تھوڑے ہی عرصے بعد جینیاتی طور پر پوری
پنجابی تھی لیکن خود کو آریائی کہلواتی تھی۔ یہی پنجابی تھی جنہوں نے
رگ وید بھی لکھی اور آگے چل کر گنگا کی تہذیب کی بنیاد بھی
رکھی۔

ٹیکسلا 1000 ق م

سقراط، افلاطون اور ارسطو سے چھ سو سال پہلے پنجاب میں ٹکاالا آباد تھا۔ یہ تین ہزار سال پہلے کا بوسٹن اور آکسفورڈ تھا، یعنی یونیورسٹیوں کا شہر۔ یہاں کی جامعات اور ان میں پڑھانے والے اساتذہ اپنے علم، تحقیق اور عقلمندی کی وجہ سے ساری دنیا میں مقبول تھے۔ ہندوستان سے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا سے لوگ پنجاب میں علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس وقت بھی پنجاب علم کا گھر تھا۔ پنجابی صرف کھلے دماغ کے ہی نہیں، کھلے دل کے بھی مالک ہوتے ہیں۔ بعد میں جب ایرانی بادشاہوں اور یونانی جرنیلوں کی یہاں حکومت رہی تو تنگ نظری سے نہیں بلکہ روشن دماغوں اور کھلے دل سے انہیں بھی قبول کیا گیا۔ ان کی اچھی چیزیں سیکھ کر انہیں اپنے فن اور ہنر سے ملا دیا جس سے مشہور زمانہ گندھارا آرٹ نے جنم لیا۔

پانینی 700ق م

پانینی ہندوستانی آریائی زبانوں کے علم کا استاد مانا جاتا ہے جس نے دنیا میں کسی بھی زبان کی پہلی گرامر لکھی۔ پانینی نے آریائی زبانوں کی گرامر / قواعد کی بنیاد رکھی جس پر پراکرت، سنسکرت، ہندی، اردو اور آج کے ہندوستان کی بے شمار زبانوں کی قواعد بنی ہوئی ہے۔ پانینی، جو کہ زبان کا سب سے پہلا اور اپنے وقت کا سب سے بڑا عالم تھا، ایک پنجابی تھا۔

آتریہ 700 ق م

آتریہ رشی پنجاب کا ایک عظیم سپوت تھا ۔ وہ حکیم بھی تھا
اور دانشور بھی۔ اس کا کام آیوویدک علم کی بنیاد بنا۔ آتریہ، ارسطو،
افلاطون اور سقراط سے بھی صدیوں پہلے تھا۔ اس وقت اس نے
ہندوستانی حکمت کو اس نہج پر پہنچایا کہ آج بھی ساری دنیا میں آیو
ویدیک مشہور و معروف ہے۔ اس کے بعد جتنی بھی ترقی آیوویدک
علم میں ہندوستانی حکیموں اور عالموں نے کی اس کی بنیاد آتریہ کی
سوچ، اس کی تحقیق اور اس کا علم تھی۔

کوتلیہ چانکیہ 300 ق م

کوتلیہ چانکیہ پنجابی تھا۔ وہ ٹکشالا یعنی ٹیکسلا کی یونیورسٹی میں
استاد رہا جہاں اس سے پڑھنے کے لیے لوگ دور دور سے آیا کرتے
تھے۔ اس کی مقبولیت کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ
ہندوستانی راجا چندر گپت موریا کا وزیر اعظم تھا اور دوسرا اس نے
سیاست کی ایک عالمی شہرت یافتہ کتاب ارتھ شاستر لکھی۔ یہ وہی
کتاب ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جواہر لال نہرو اس کتاب
کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سویا کرتا تھا۔

چانکیہ اور چندر گپت کے بارے میں ایک کہانی مشہور ہے ۔

ایک دفعہ چندر گپت اپنے سیاسی جھمیلوں سے اکتا کر جنگلوں میں گھوم
رہا تھا تو اس نے وہاں ایک کٹیا دیکھی جس کے سامنے جنگلی گھاس
اُگا ہوا تھا۔ کٹیا میں سے ایک سادھو نکلا اور گھاس کو پانی لگانے لگا۔
چندر گپت نے حیران ہو کر اُس سادھو سے دریافت کیا تو اس نے
کہا وہ گھاس کو میٹھا پانی لگا رہا ہے تا کہ جنگلی گھاس ختم ہو سکے۔
چندر گپت نے کہا کہ تم یہ گھاس کاٹ کیوں نہیں دیتے۔ سادھو نے
کہا کہ وہ میٹھا پانی اسی لیے لگا رہا ہے کہ شکر اور پانی گھاس کی
جڑوں میں جذب ہو جائیں گے اور پھر کیڑے شکر کھانے آئیں گے تو
ساتھ میں اس گھاس کی جڑیں بھی کھا جائیں گے ،اس طرح یہ گھاس
خود بخود ہی ختم ہو جائے گی۔ چندر گپت نے اُسی وقت یہ فیصلہ کر لیا
کہ وہ جب بھی راجا بنے گا اسی سیانے سادھو کو اپنا وزیر اعظم بنائے
گا اور اس نے یہی کیا۔ یہ سادھو کوتلیہ چانکیہ تھا۔

چانکیہ کی سیاست کی کتاب ارتھ شاستر اس زمانے میں لکھی
گئی جب ارسطو کا شاگرد سکندر اعظم ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔
اس کے بعد اس پائے کی کتاب اٹلی کے 'نکولو میکاولی ' نے لکھی جس
کا نام "دا پرنس" ہے۔ میکاولی نے یہ کتاب 16 ویں صدی عیسوی
میں لکھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت بن رہی

تھی، اُندلس سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہو رہی تھی اور کولمبس

امریکا دریافت کر رہا تھا۔ آسان لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ

چانکیہ سے کوئی دو ہزار سال بعد ۔پنجاب کے چانکیہ نے یہ کتاب

تب لکھی جب افلاطون اپنی کتاب بعنوان ریاست لکھ رہا تھا۔

"ریاست" افلاطون کی فلسفہ ریاست پر شہرۂ آفاق کتاب ہے اور

چانکیہ کی کتاب دُنیا کی سب سے قدیم کتاب ہے جو ریاست اور

سیاست پر لکھی گئی۔

پنگالا 100ء

پنگالا ایک پنجابی ریاضی دان تھا۔ ریاضی میں جو کام اُس نے

کیا وہ صدیوں بعد دُنیا کو ملا اس لیے دُنیا اس کے کام سے فائدہ

حاصل نہ کر سکی۔ جو کام پنگالا کر چکا تھا وہی کام یورپی عالم ڈیڑھ

ہزار سال بعد کر پائے۔ پنگالا کے کارناموں میں پاسکل ٹرائینگل،

بائینومئیل تھیورم اور ریکرِسیو ایلگورِتھم وغیرہ شامل ہیں۔ پنگالا کو بائیزی

سسٹم کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ بائیزی سسٹم ریاضی کا وہ نظام ہے

جس پر آج کمپیوٹر، موبائل فون، انٹرنیٹ اور خلائی جہازوں کی بنیاد

ہے۔

براہما گپتا 600ء

براہما گپتا پنجابی ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔ وہ اپنے زمانے میں دنیا کا ریاضی کا سب سے بڑا اُستاد تھا۔ اس کا کام پنجاب سے عرب اور وہاں سے یورپ پہنچا اور جدید ریاضی، الجبرا اور کمپیوٹر کی بنیاد بنا۔ راجا داہر کی راجدھانی جو کراچی سے لے کر ساہیوال تک تھی، کے فتح ہونے کے بعد یہاں کا ایک ریاضی دان کانکا، خلیفہ المنصور کے دربار میں گیا تو براہما گپتا کا کام بھی ساتھ لے گیا جو محمد الفاضاری نے 'سندھ ہند' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔ یہاں سے اعشاریہ اور صفر کے فلسفے پوری دنیا میں مقبول ہوئے۔ اس کام پر الخوارزمی نے 'الجمع و لتفریق فی حساب الہند' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو بعد ازاں لاطینی میں ترجمہ ہو کر یورپ پہنچی۔ یورپ کی ریاضی، طبعیات اور سائنس کی ترقی کی ایک بڑی بنیاد، ایک پنجابی ریاضی دان کا کارنامہ تھا۔

بابا فرید گنج شکر 1200ء

بابا جی پنجاب کے عظیم صوفی بزرگ تھے۔ پنجابی زبان میں صوفی شاعری کر کے انہوں نے پنجابی کو ہندوستان کی بڑی زبانوں میں شامل کر دیا۔ بابا جی سلطان ناصر الدین محمود کے داماد بھی تھے۔ ابن بطوطہ نے بھی بابا جی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بابا جی ہندوستان کے بادشاہ کے پیر تھے۔ بابا جی کا نور پنجاب سے نکل کر

دور دور تک پھیلا۔

گرونانک 1500ء

بابا گرونانک سکھ مت کے بانی تھے۔ آپ نے پنجاب کی دھرتی پر رب کا پرچار کیا اور سکھوں کے پہلے گرو بنے۔

بلھے شاہ 1700ء

بلھے شاہ پنجاب کے عظیم صوفی بزرگ تھے جن کی شاعری آج بھی ہر پنجابی کی زبان پر ہوتی ہے۔

وارث شاہ 1700ء

وارث شاہ پنجاب کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ آپ کا شاہکار 'ہیر رانجھا' بہت مقبول و معروف ہے اور ہر موقع پر گایا جاتا ہے۔ ہیر وارث شاہ نے پنجابی شاعری کو ایک اعلیٰ مقام پر پہنچایا ہے، جہاں وہ دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

علامہ اقبال 1900ء

ڈاکٹر صاحب اردو اور فارسی کے عظیم شاعر تھے۔ آپ نے جرمنی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو نوبل انعام دینے پر بھی غور کیا جاتا رہا لیکن یہ انعام بنگال کے رابندر ناتھ ٹیگور کے حصے آیا۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں

کہ ڈاکٹر صاحب اس انعام کے معیار پر پورے نہیں اُترے۔ نوبل انعام ہر عظیم ادیب کو نہیں دیا جاسکتا اس لیے کسی ایک ہی کو دیا جاتا ہے۔ ٹیگور صاحب اس وقت اپنی نظموں خاص طور پر گیتا نجلی کے انگریزی ترجمے کی وجہ سے مغربی دنیا میں خاصے مقبول تھے اس لیے شاید نوبل انعام کا سہرا ان کے سر سجا۔

ڈاکٹر صاحب کو پاکستان کا بانی مفکر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا۔ کئی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے سوتے ہوئے نیند میں یہ خواب دیکھا لیکن بہت لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خواب ایک خواہش کا اظہار ہے، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ میرا خواب ہے میرا بچہ بڑا آدمی بنے۔ بہر حال مطالعہ پاکستان کی کتب میں یہی پڑھایا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے 1930ء کے خطبہ الہ آباد میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا نظریہ پیش کیا۔ تاہم برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی کی بودلیئن لائبریری میں علامہ صاحب کے ایک خط، جو انہوں نے 4 مارچ 1933 کو تاریخ دان ایڈورڈ تھامسن کو لکھا تھا، میں وضاحت کی ہے کہ 1930ء والے خطبے میں انہوں نے ایک الگ علیحدہ وطن کا تصور نہیں دیا تھا بلکہ متحدہ ہندوستان میں ایک مسلم صوبے کا نظریہ دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو کئی لوگ دنیا کا عظیم فلسفی بھی کہتے ہیں مگر

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب عالمی سطح کے فلسفی نہیں بلکہ برصغیر کے ایک بڑے فلسفی کہے جاسکتے ہیں۔ اصل میں ڈاکٹر صاحب کو فلسفی کے طور پر پیش کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا اصل کارنامہ ان کی شاعری ہے۔ ویسے نثر میں ڈاکٹر صاحب کی تین کتابیں مشہور ہیں۔ ایک ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ جو ایران میں مابعد الطبیعات کے موضوع پر ہے۔ ایک ان کی ڈائری ہے جس میں انہوں نے مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے پیرے لکھے ہیں اور تیسری کتاب اسلام کے فلسفے پر سات لیکچروں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب خاصی ترقی پسندانہ ہے اور اسلام کے ترقی پسند ہونے کی عکاس ہے۔ بہرحال، ان کا فلسفہ ان کی شاعری کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انہیں فلسفی کہنا، ان کی شاعری کو کمتر کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر صاحب دنیا کے عظیم شاعر تھے اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ آپ کی شاعری، دنیا کی کسی بھی زبان میں کی گئی شاعری کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو شاعر مشرق کا خطاب دیا گیا ہے۔ آپ پاکستان کے قومی شاعر بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شاعری ایران میں بہت مقبول ہے اور آپ کو اردو زبان کے سب سے بڑے شعراء میں سے ایک مانا جاتا ہے۔

فیض احمد فیض 1900ء

فیض صاحب اردو زبان کے بہت بڑے اور جدید شاعر مانے جاتے ہیں۔ آپ کا نام ادب کے نوبل انعام کے لیے تجویز ہوا۔ فیض صاحب نے روس سے لینن ایوارڈ جیتا۔

ڈاکٹر عبدالسلام 1900ء

ڈاکٹر صاحب طبیعات کے ماہر سائنس دان تھے۔ فزکس کے میدان میں آپ کی خدمات کے پیشِ نظر آپ کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ یہ کسی بھی اسلامی ملک کا سائنس میں پہلا نوبل انعام تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کی قبر کے کتبے پر لکھا ہے کہ وہ دنیا کے پہلے سائنسی "نوبل انعام یافتہ" ہیں۔ ہوا یوں کہ ان کی قبر کے کتبے پر لکھوایا گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب دنیا کے پہلے نوبل انعام یافتہ مسلمان سائنسدان ہیں لیکن ایک صاحب نے کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب تو احمدی تھے اور آئینِ پاکستان کے مطابق احمدی تو مسلمان نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کی قبر سے مسلمان کا لفظ ہٹا دیا گیا۔ لہٰذا اب ڈاکٹر صاحب کی قبر پر انگریزی میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب دنیا کے پہلے نوبل انعام یافتہ سائنس دان ہیں۔ ویسے ڈاکٹر صاحب کو پنجاب، پنجابی ثقافت اور پنجابی زبان سے بہت محبت تھی۔ وہ اپنا انعام لینے کے لیے پنجاب کی روایتی پگڑی پہن کر گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بانی اور روحِ

رواں تھے۔ تاہم جب بھٹو حکومت نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا
تو ڈاکٹر صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر بھی آپ نے پاکستان کے
ایٹمی پروگرام کی مدد جاری رکھی۔ اسّی کی دہائی میں انہیں اس سلسلے
میں ایک میٹنگ میں خفیہ طور پر پاکستان بلوایا گیا۔ خفیہ اس لیے کہ
اسلام کے سپاہی جنرل ضیاء قوم کو کیا جواب دیتے کہ وہ اسلامی بم
بنانے کے لیے ایک احمدی سے مدد طلب کر رہے ہیں۔ خیر، ڈاکٹر
صاحب نے جب یہ میٹنگ شروع کی تو کہا کہ اگر سب لوگ پنجابی
سمجھتے ہوں تو وہ پنجابی میں بات کرنا چاہیں گے۔ سب لوگ پنجابی
سمجھتے تھے لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے تھیوریٹکل فزکس کے گہرے پہلوؤں
پر ڈیڑھ گھنٹہ پنجابی میں گفتگو کی۔

استاد دامن 1900ء

استاد جی کا اصل نام چراغ دین تھا۔ آپ کی پنجابی شاعری
پنجاب کے بچے بچے کی زبان پر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے
فیض سے پوچھا کہ وہ پنجابی شاعری کیوں نہیں لکھتے تو انہوں نے کہا
کہ وہ سلطان باہو، بلھے شاہ اور وارث شاہ کے مقابلے میں پنجابی
شاعری نہیں کر سکتے۔ یہ صرف دامن کا ہی کمال ہے۔ استاد دامن
پرانے کانگریسی تھے اس لیے تقسیم کے وقت لوگوں نے ان کے گھر
کا کتب خانہ جلا دیا۔ ایک مرتبہ ایک مشاعرے میں استاد دامن

ہندوستان گئے تو پنڈت جواہر لال نہرو نے فون کر کے کہا کہ میں بندہ بھیج رہا ہوں، تم میرے پاس وزیر اعظم ہاؤس آؤ۔ استاد نے کہا کہ پنڈت اگر تم میرے وہی پرانے دوست ہو تو خود آجاؤ۔ یہ سُن کر پنڈت جواہر لال سارے پروٹوکول چھوڑ کر خود استاد دامن کو لینے آئے۔ وہاں مشاعرے میں آپ نے ایک شعر پڑھا اور سب رونے لگ گئے۔ وہ شعر یوں تھا:

لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے

روئے تسیں وی او، روئے اسیں وی آں

(آنکھوں کا لال رنگ بتاتا ہے کہ روئے آپ بھی ہیں اور روئے ہم بھی ہیں)۔

نہرو نے استاد دامن سے کہا کہ ہندوستان آجاؤ میں تمہیں ہندوستانی شہریت دے دوں گا۔ استاد دامن نے کہا کہ رہوں گا تو میں لاہور ہی، چاہے جیل میں رہوں۔ استاد دامن کا ایک اور مشہور شعر ہے:

پاکستان دیاں موجاں ای موجاں

چارے پاسے فوجاں ای فوجاں

(پاکستان میں بہت موج ہے، ہر طرف فوج ہی فوج ہے)۔

منٹو 1900ء

اردو زبان کے عظیم کہانی نویس سعادت حسن منٹو اردو کہانی کو عالمی معیار پر لانے والے افسانہ نگار تھے۔ آپ کی کہانیاں آج بھی اردو زبان کی مشہور ترین کہانیاں سمجھی جاتی ہیں۔

استاد بڑے غلام علی خان 1900ء

استاد بڑے غلام علی خان کلاسیکی موسیقی میں ایک عالمی شہرت یافتہ نام ہیں۔

خوشونت سنگھ 2000ء

خوشونت سنگھ وکیل، صحافی، سفارت کار، سیاست دان اور لکھاری تھے۔ آپ انگریزی زبان میں لکھتے تھے۔ تاریخ، ثقافت، سیاست اور ادب میں ان کی تصانیف ساری دنیا میں مشہور ہوئیں۔

گلزار 2000ء

گلزار جانے پہچانے ادیب، شاعر اور ہدایت کار ہیں۔ گلزار کی شہرۂ آفاق فلموں میں 'موسم'، 'آندھی'، 'ماچس' اور 'ہوتوتو' اور ٹی وی سیریل' مرزاغالب' شامل ہیں۔

رومیلہ تھاپر 2000ء

رومیلہ تھاپر ہندوستانی تاریخ کی ایک عالمی شہرت یافتہ محقق ہیں۔ آپ کو قدیم ہندوستانی تاریخ کی سند سمجھا جاتا ہے اور آپ کی کتب ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ پینگوئن، ہسٹری آف انڈیا کی پہلی جلد، جو قدیم ہندوستان کے بارے میں تھی، رومیلہ نے ہی لکھی ہے۔ اس بارے میں ایک مزے دار واقعہ ہے کہ فیض صاحب ایک دن اپنے داماد شعیب ہاشمی سے یہ کتاب لے کر گئے۔ کچھ دن بعد وہ خاصے خوش ہو کر آئے کہ یہ تو بہت اچھی کتاب ہے اس کی دوسری جلد بھی دیجیئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ دوسری جلد کسی اور تاریخ دان نے لکھی ہے تو بہت آزردہ ہوئے اور اُسے پڑھنے سے ہی انکار کر دیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُندلس میں ایک گڈریا رہتا تھا جسے خواب آیا کہ ایک ہیرے جواہرات سے بھری دیگ اہرام مصر کے سامنے دفن ہے۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر مصر کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ کئی ماہ کی سختیوں کے بعد مصر پہنچ گیا۔ خواب میں دکھائی جانے والی جگہ پر کھدائی کرنے لگا لیکن کچھ نہ ملا بلکہ ڈاکوؤں نے اسے پکڑ لیا۔ اس کی تلاشی لی گئی مگر کچھ نہ نکلا۔ اس نے بہت منت سماجت کی اور سارا واقعہ سنایا۔ یہ سن کر ڈاکوؤں کے سردار نے ایک قہقہہ لگایا کہ یہ بندہ تو پاگل ہے اسے چھوڑ دو، مجھے بھی چالیس برس سے

یہ خواب آرہا ہے کہ اندلس کی فلاں وادی میں ہیرے جواہرات
کی ایک دیگ دفن ہے۔ ڈاکو گڈریے کو چھوڑ کر چلے گئے اور گڈریا
وہیں مٹی کی مورت بنا بیٹھا رہا۔ جس جگہ کی نشانی ڈاکو بتا گئے تھے
وہ اُسی گڈریے کا گھر تھا۔ گڈریا گھر واپس لوٹا اور وہ جگہ کھودی تو
ہیروں سے بھری دیگ نکلی۔ ہمارا حال بھی اسی گڈریے والا ہے۔
ہمارے اپنے پنجاب میں ہر طرف ہیرے موتیوں جیسے لوگ بکھرے
پڑے ہیں اور ہم انہیں ڈھونڈنے، چمکانے اور ان کی قدر کرنے کی
بجائے سات سمندر پار ہیرے موتی ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

5

جنگ

لوگ کہتے ہیں کہ پنجابی کبھی نہیں لڑتا۔ جب بھی کسی قوم
نے ان پر حملہ کیا، پنجابیوں نے سر تسلیم خم کر کے ان کی جی
حضوری شروع کر دی یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے اوراق میں پنجاب
ہمیشہ غلام ہی پیش کیا گیا ہے۔ ناکام، شرمندہ، اجنبی حاکموں کا چاکر۔

ویسے تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
ظہور اسلام کے بعد عربوں نے اندلس سے لے کر مصر، عراق،
شام، وسطی ایشیا اور ایران تک کا اتنا بڑا علاقہ اسّی سال کی مدت میں
فتح کر لیا لیکن 712ء میں پنجاب کا ایک حصہ فتح کرنے کے بعد پورا
پنجاب فتح کرنے میں عرب اور وسطی ایشیائی مسلمانوں کو تین صدیاں
لگ گئیں۔ یہ تاریخی حقائق جو کہانی سنانا چاہتے ہیں، وہ سننے کے لیے

ہمیں جنگ جیتنے والے سرکاری تاریخ دانوں کے نعرے چھوڑ کر ان
لاشوں کو پڑھنا پڑے گا جو برسوں سے اپنے دیس کی خاطر قربان
ہوتی آئی ہیں۔

پنجاب کا سب سے پرانا نام تھا ''سمہہ دوار'' اس سے مراد
ہے بڑا دروازہ یعنی ''صدر دروازہ''۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ
وسطی ایشیا یا ایران سے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ایک ہی راستہ تھا،
دریائے سندھ کا دیس پنجاب۔ جب بھی کوئی ہندوستان پر حملہ آور
ہوا وہ پنجاب کے رستے سے ہوا۔ ہر مرتبہ پنجاب نے ہندوستان کا
دفاع کیا۔ ہر حملہ آور کو مار بھگایا۔ جو جنگیں پنجاب نے جیتیں ان
کا تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا کیونکہ پنجاب میں تاریخ لکھنے کی
روایت انگریزوں سے پہلے تھی ہی نہیں۔ اپنا ماضی، اپنی تاریخ پنجابی
اپنی لوک داستانوں کے ذریعے زندہ رکھتے تھے۔ انگریزوں نے جب
پنجابی زبان کو دبانا شروع کیا تو پنجاب کی تاریخ اور لوک داستانیں
بھی دفن ہونے لگیں۔ پنجاب کی تاریخ انگریز حکمرانوں نے لکھنی
شروع کی تو لوک داستانوں کو کوئی اہمیت نہ دی بلکہ تاریخ کی وہ
کتب دیکھیں جو وسطی ایشیائی اور یونانیوں کی لکھی ہوئی تھیں، جن
میں پنجاب کو بُرا اور ناکام اور خود کو فاتح مرقوم کیا گیا تھا۔ اس
طرح تاریخ کی جو کتب انگریز دور میں لکھی گئیں ان میں بھی پنجاب

ناکام اور بُرا ہی رہا۔ تاریخ کا یہی رنگ آج بھی پنجاب پر حاوی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اُسی وسطی ایشیائی اور یونانی تاریخ کو دوبارہ پڑھیں اور ان میں درج نعرے اور نتائج کی بجائے حقیقت کو تلاش کریں اور پھر غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ اس طرح تاریخ کا ایک دوسرا رُخ ہمارے سامنے آئے گا۔ اس دوسری کہانی سے پنجاب کا درد اور کرب معلوم ہو گا۔ یہ معلوم ہو گا کہ جسے پنجاب نے ہرایا اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا اور دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس کسی سے پنجاب ہارا، وہ اتنا طاقتور تھا کہ اس سے وسطی ایشیا اور سارا ہندوستان بھی ہار گیا، لیکن بدنام صرف پنجاب ہوا۔

سب سے پہلے آریا آئے۔ یہ تقریباً چار ہزار قبل مسیح کے خانہ بدوش، جنگلی قسم کی قوم تھی۔ روز صبح اٹھ کر جانوروں کا شکار کرتے تو پیٹ بھر پاتے۔ لڑنا مرنا ہی ان کی زندگی تھا اس لیے انہوں نے ہتھیار بھی بنائے اور گھوڑا سدھا کر اس کے پیچھے رتھ لگا کر اس زمانے کے جنگی ٹینک بھی تیار کر لئے۔ اس زمانے میں پنجاب کے ہڑپہ میں نہ کسی نے گھوڑا سدھایا تھا نہ ہی جنگی ہتھیار بنائے تھے۔ یہ پنجاب کے تہذیب یافتہ لوگ تھے۔ تجارت، کھیتی باڑی، فن اور ثقافت پر توجہ دیتے تھے۔ آج سے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے

یہ آریا اپنا دیس چھوڑ کر نکلے اور ساری دنیا میں جا بسے۔ کچھ یورپ
کی طرف نکل پڑے تو کچھ ترکی۔ کچھ ایران میں جا کر آباد ہو
گئے۔ ایران کا نام بھی آریا سے ہی نکلا ہے۔ ہزار برسوں میں ایک
شاخ افغانستان سے ہوتی ہوئی بلوچستان آ گئی اور 1500 ق-م یعنی
آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل، یہاں پنجاب آ گئی ۔ لیکن
ان آریاؤں نے پنجاب پر کوئی حملہ نہیں کیا بلکہ پانی کی تلاش اور
زرخیز زمین ڈھونڈتے ہوئے وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آریا تہذیب
یافتہ نہ تھے لہٰذا وہ ہڑپہ سے دور رہے اور شہر کے ارد گرد اپنے خیمے
لگا لیے۔ خیمے آہستہ آہستہ جھونپڑے بن گئے۔ پنجابیوں سے کھیتی باڑی
سیکھ لی۔ اوزار بنانے میں مہارت پہلے سے تھی اب کھیتی باڑی کر کے
گاؤں بسا لیے۔

ہندو مت کی سب سے پہلی کتاب 'رگ وید' میں کہا گیا ہے
کہ ہڑپہ کے لوگ بہت امیر تھے۔ سونے جواہرات کے انبار ان کے
پاس موجود تھے اور وہ قلعوں میں رہتے تھے۔ رگ وید میں لفظ
سندھ، دریائے سندھ کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور دریائے سندھ کی
سرزمین کے لئے بھی، جس سے مراد پنجاب کا علاقہ ہے۔ رگ وید کے
مخصوص الفاظ کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"سندھ گھوڑیاں وِچ شاہُوکار، کپڑیاں وِچ شاہُوکار، ودھیا گھڑے

ہوئے سونے گہنیاں وِچ شاہُوکار، خوراک وِچ شاہُوکار، سجری اُن وِچ شاہُوکار، ایتھے بہوں مُنج لبھدی اے تے ماکھیوں دینڈر پھُلاں نال شنگاریا سُبھا گا دریا وگدا اے۔"

(سندھ گھوڑوں میں شاندار، کپڑوں میں شاندار، بہترین زیورات میں شاندار، خوراک کی فراوانی میں شاندار، عمدہ اون میں شاندار، یہاں فصل بے تحاشہ ملتی ہے اور دنیا کا عظیم ترین دریا بہتا ہے)۔

ہڑپہ کی تہذیب کی گونج پورے ایک ہزار سال تک برقرار رہی۔ دو ہزار قبل مسیح تک ہڑپہ اپنے عروج پر رہا۔ دو ہزار ق-م یعنی آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل یہ تہذیب زوال کا شکار ہو گئی۔ اس کا اندازہ ہمیں کھنڈرات سے ملی چیزوں سے ہوتا ہے۔ مجسمے، مہریں، کھلونے اور مزید چیزیں جو ڈھائی ہزار ق-م تک بہترین ہنر مندی کا نمونہ تھیں، دو ہزار ق-م میں خاصے گھٹیا معیار کی ہو گئیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جب آریا اور پنجابیوں کی جنگیں ہو یں تو اس وقت ہڑپہ کی تہذیب اپنی طبعی عمر پوری کر کے زوال پذیر ہو چکی تھی۔ آہستہ آہستہ پنجاب کی تہذیب کمزور ہو گئی اور آریا پنجاب میں خاصے مضبوط ہو گئے۔ انہوں نے شہروں پر حملہ کر کے لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔ گھوڑے، رتھ اور بہتر ہتھیار ان کے پاس پہلے سے موجود تھے۔ شہروں کے ارد گرد گاؤں اور بستیاں بسا

کر انہوں نے شہر وں کو پہلے ہی گھیر رکھا تھا۔ ایک ایک کر کے
آریا جنگلیوں نے پنجاب کی رہی سہی تہذیب بھی ختم کر ڈالی۔ بے
شمار جنگیں ہوئیں اور پنجابیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جن جنگلیوں
سے یورپی، ترکی، ایرانی اور افغانی نہ جیت سکے، انہیں پنجابی کیسے ہرا
پاتے۔ لیکن ڈٹ کر مقابلہ کیا جس کا ذکر رگ وید میں بار ہا ملتا ہے
اور اسی لیے آریاؤں نے جیتنے کے بعد بھی پنجابیوں کو بہت بدنام کیا۔
کہا کہ یہ داس یعنی غلام ہیں۔ یہ کالے ہیں۔ ان کے ہونٹ عجیب
ہیں، ناک پچکے ہیں اور یہ قلعوں میں رہتے ہیں۔ یہ بھی کہا کہ
آریاؤں کے دیوتا نے پنجابیوں کے قلعے تباہ کر ڈالے۔ یہ سب کچھ
کہا لیکن کہیں نہیں کہا کہ پنجابی ڈرپوک ہیں، لڑے نہیں، مقابلہ نہیں
کر سکے، پنجابی بے غیرت ہیں۔ یعنی ترکی، یورپ، ایران اور افغانستان
میں آریاؤں نے فتوحات اپنے بل بوتے پر کیں، لیکن پنجاب کو
ہرانے کے لیے انہیں اپنے دیوتا بھرت کی ضرورت پڑی اور دیوتا کو
بھی پنجاب فتح کرنے کے لیے اتنا زور لگانا پڑا کہ رگ وید میں اس
پر بڑا فخر کیا گیا ہے کہ دیوتا نے آریاؤں کو جتوایا۔ رگ وید میں
پنجابیوں کے بارے میں مرقوم ہے کہ پنجابیوں کو ہم نے پیس کر
رکھ دیا ہے لیکن یہ ہماری بات نہیں مانتے۔ ہمارے خدا وٗں کو نہیں
مانتے، ہمارے رسم ورواج نہیں مانتے۔ یہ اپنی سوچ میں آزاد رہتے
ہیں اور یہ بات صرف رگ وید میں ہی نہیں لکھی گئی بلکہ صدیوں

بعد سنسکرت کے عالم پانینی نے بھی لکھا کہ پنجاب مذہبی کٹڑپن سے آزاد علاقہ تھا۔ مزید دشمنی آریاؤں نے مہابھارت کی صورت میں نکالی، جس میں درج ہے کہ دریائے بیاس کے قریب دو بھوت رہا کرتے تھے جن کی اولاد یہ پنجابی قوم ہے اور یہ خدا کی مخلوق نہیں۔ اسی بناء پر ان لوگوں میں ذات پات کی کوئی واضح اور لگی بندھی تقسیم نہیں۔

ایک بڑی جنگ کا ذکر رگ وید میں کیا گیا ہے۔ اسے دس راجوں کی جنگ یا داس راجیہ کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ سرسوتی دریا کے کنارے آباد آریاؤں اور پنجابیوں کے درمیان ہوئی۔ دریا سے ہندوستان کی طرف آباد آریا قبیلے بھرت اور پنجاب کی طرف آباد دس پنجابی قبیلے۔ جنگ پارُوسنی یعنی دریائے راوی کے کنارے لڑی گئی کیونکہ مسئلہ بھی پاروسنی کے پانی کا ہی تھا۔ یہ جنگ تو بھرت قبیلہ جیت گیا لیکن اس قبیلے کے اتنے لوگ مارے گئے کہ وہ پاروسنی کا پانی استعمال نہ کر سکے۔ اسی جنگ کے بعد سرسوتی دریا کے ایک طرف پنجاب رہ گیا اور دوسری طرف بھرت قبیلے کے نام پردیس بھارت ہو گیا۔ آریاؤں نے ہر پنجابی کے ساتھ عداوت نہیں رکھی، بلکہ کچھ پنجابی داس راجوں کی تعریف بھی لکھی ہے کہ وہ اونچے کردار کے مالک تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اور پنجابیوں کا ذکر بھی رگ

وید میں کیا گیا ہے جنہیں پنی کہا جاتا تھا۔ یہ پنی وہ امراء تھے جو
عراق اور مصر کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ یہ پنی پنجابی ہی
تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آریاؤں کو علم و
ثقافت اور عقل و دانش دی جس سے گنگا جمنا کی ویدک تہذیب کا
جنم ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان پنی لوگوں نے ملک شام میں
بحیرہ روم کے کنارے پر تجارت کی غرض سے بستیاں بنائی ہوئی
تھیں۔ جب پنجاب میں آریاؤں کے ساتھ جنگیں زیادہ ہونے لگیں
تو بعض پنی ملک شام جا کر بس گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ پنی وہاں پہلے
فنی کہلائے اور بعد ازاں Phoenician فونیشیئن۔ یہی فونیشیئن تھے
جن سے قدیم یونان نے ساری علم و حکمت اور تہذیب سیکھی۔
سارے یونانی فلسفی اور حکیم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ فونیشیئن
قوم اپنے وقتوں کی عظیم ترین قوم تھی اور سارا علم یونانیوں نے ان
سے سیکھ کر ہی آگے بڑھایا جس سے یورپی تہذیب نے جنم لیا۔
فونیشیئن قوم کا دیس بحیرۂ روم کے کنارے والا ملک شام ہی تھا اور
ان کے عروج کا زمانہ 1500 ق-م سے 300 ق-م بتایا جاتا ہے۔
یہ بالکل وہی زمانہ بنتا ہے جب پنجاب میں آریاؤں نے تباہی مچائی
تھی۔ اس طرح دیکھا جائے تو دراصل پنجاب کا علم ہی ہے جو پنیوں
سے یونان گیا اور پھر یورپی علم و تہذیب کی بنیاد بنا۔

پنجاب میں آریا فاتح ہو کر چھا گئے اور شروع شروع میں انہوں نے وہاں شادیاں بھی کیں جس سے ایک نئی نسل تیار ہو گئی جن میں زیادہ تر پنجابی اور کچھ آریائی جینوم تھے لیکن وہ کہلواتے آریا ہی تھے۔ پھر ان پنجابی آریاؤں نے کچھ ہی صدیوں میں گنگا کی وادی میں ایک نئی ویدک تہذیب کی بنیاد رکھ دی۔ یہی ویدک تہذیب تھی جس نے آہستہ آہستہ آریا اور پنجابی داس علیحدہ کر ڈالے۔ اب آریا اعلیٰ اور داس کمتر ہو گئے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پنجابی اور آریاؤں کی شادی نہیں ہو سکتی۔ یہ رگ وید سے کچھ صدیوں بعد کا زمانہ ہے۔ رگ وید کے مطابق دنیا کا سب سے بہترین دیس پنجاب تھا اور سب سے مقدس دریا، پنجاب کا دریا سرسوتی۔ بعد ازاں جب یہاں سے آریا وادئ گنگا میں جا بسے تو بعد کے ویدوں کے مطابق سب سے بہترین دیس وادئ گنگا ٹھہری اور سب سے مقدس دریا گنگا و جمنا بن گئے اور پنجاب کہیں کھو گیا۔

داس راجیہ کے بعد ویدک آریا دوبارہ کبھی پنجاب نہیں آئے لیکن 529 ق-م میں ایران کے کورش اعظم نے پنجاب پر حملہ کیا اور منہ کی کھا کر واپس چلا گیا۔ بعد ازاں 516 ق-م میں کورش اعظم کے پوتے، دارائے اعظم نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اس زمانے میں ایرانی فوج دنیا کی سب سے طاقتور فوج تھی۔ پنجابیوں نے ڈٹ کر

مقابلہ کیا تاہم دارانے کافی جدوجہد کے بعد پنجاب کا کچھ حصہ فتح
کرلیا۔ یہ دارا اوّل تھا۔ جب دارا سوم پر سکندر اعظم نے حملہ کیا
تو اُس نے پنجابی راجا پورس سے مدد طلب کی۔ پورس نے دارا کو
جنگی ہاتھیوں کا ایک دستہ بھجوایا لیکن اس کے ایران پہنچنے سے پہلے
ہی دارا قتل ہو گیا۔

326 ق-م میں جب سکندر اعظم نے پنجاب پر حملہ کیا تو
پورس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا ، اس سکندر اعظم کا، جو ایران، یونان
اور عراق کا فاتح تھا۔ یونانی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ
پنجابیوں نے بہت دلیری سے یہ جنگ لڑی۔ سکندر ان سے بہت
متاثر ہوا اور اس نے پورس کو اس کی ریاست واپس کر کے اپنا
دوست بنا لیا۔ جنگ جیتنے والے یونانی تاریخ دان یہ بھی کہتے ہیں کہ
جنگ والے دن خاصی بارش کی وجہ سے پنجابیوں کے ہتھیار اور جنگی
رتھ بے کار ہو گئے تھے۔ اگر اس روز بارش نہ ہوتی اور ہاتھی اپنی
ہی فوج پر حملہ نہ کرتے تو یہ جنگ پنجابی جیت چکے ہوتے۔ کچھ نئے
تاریخ دان یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ جنگ سرے سے ہوئی ہی نہیں
کیونکہ سکندر اعظم پنجابیوں کی طاقت سے آگاہ تھا۔ اس لیے ڈر کر
اُس نے پورس سے صلح کرلی۔ اس نئی تھیوری کے مطابق یونانی
تاریخ دانوں نے سکندر کی عزت رکھنے کے لیے پورس کو اس کی

ریاست واپس کر دینے والی کہانی گھڑی ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ پتا چلتا ہے کہ انگریز مورخین نے ہمیں نیچا دکھانے کے لیے صرف اتنا ہی رقم کیا ہے کہ پنجابی ہار گئے ، وہ بھی اس طرح جیسے پنجابی حملہ آوروں کے استقبال کے لیے پھول لے کر کھڑے تھے کہ خوش آمدید۔ اور ہم ہیں کہ ذرا سی تکلیف اور محنت کر کے اپنے ماضی کی اصل حقیقت جاننے کی بجائے خود کو کوستے رہتے ہیں۔

سکندر اعظم کے بعد جب ہندوستان میں چندر گپت موریہ نے سلطنت کی بنیاد رکھی تو اس کے پوتے اشوک نے سارا ہندوستان فتح کر لیا۔ اس طرح سارے ہندوستان کے ساتھ پہلی مرتبہ پنجاب بھی وادئ گنگا کی راجدھانی میں آ گیا۔

اس کے بعد پنجاب کو کشانوں نے بھی فتح کیا۔ یہ یُوچی قوم کے جنگلی قبائل، چین کے مغربی سرحدی علاقوں میں آباد تھے۔ دوسری صدی ق-م میں منگول قبیلوں سے بھاگ کر یہ وسطی ایشیا کے رستے ہندوستان آ گئے اور یہاں آہستہ آہستہ بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ ان کی فتوحات میں چین، کرغستان، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور نیپال کے بڑے علاقے شامل ہیں۔ جن سے یہ تمام قومیں نہ جیت پائیں انھی سے پنجابی بھی ہار گئے۔ لڑے ضرور، لیکن ہار گئے۔

پنجاب پر عربوں نے پہلا حملہ 636ء میں کیا لیکن ہار کر
واپس لوٹ گئے۔ اگلے برس دوبارہ آ کر مکران پر حملہ کیا اور قابض
ہو گئے لیکن کچھ ہی عرصہ میں پنجابیوں نے اپنا علاقہ واپس لے لیا۔
642ء میں پرف عربوں نے حملہ کیا اور مکران پر پکا قبضہ کر لیا۔ پھر
662ء اور 664ء میں عربوں نے پنجاب پر حملہ کر کے قلات کو
لوٹ لیا۔

712ء میں راجا داہر کی راجدھانی مکران سے ساہیوال تک
پھیلی ہوئی تھی۔ حجاج بن یوسف نے دوبار افواج بھجوائیں مگر وہ
پنجابیوں سے خوفزدہ ہو کر واپس لوٹ گئیں۔ پھر حجاج نے محمد بن
قاسم کو پتھر پھینکنے والی توپ کے ساتھ روانہ کیا۔ اس وقت دیبل شہر
کا گورنر راجا داہر کا بھتیجا تھا۔ عرب فوج کئی دن کی کوشش کے بعد
بھی پنجابیوں کو ہرانے میں ناکام رہی۔ پھر ایک غدار نے عربوں کو
جا کر یہ بتایا کہ شہر میں بڑے مندر پر جب تک جھنڈا لگا رہے گا
یہ پنجابی ہار نہیں مانیں گے۔ عربوں نے توپ سے پتھر پھینک کر
جھنڈا گرا ڈالا اور پنجابی ہمت ہار گئے اس طرح عربوں نے شہر فتح
کر لیا۔

ویسے تو محمد بن قاسم نے پنجاب میں دیالو رویہ رکھا لیکن
دیبل کے شہر میں ، شاید اگلی افواج کو ڈرانے کے لیے ، اس نے تین

دن تک قتل عام کیا۔ عورتوں کو کنیزیں اور بچوں کو غلام بنالیا۔
یہاں سے عرب اتنے غلام لے کر گئے کہ عراق میں جٹوں کے
بازار لگ گئے۔

راجا داہر کا عربوں کے ساتھ مقابلہ راوڑ کے مقام پر ہوا۔ پنجابی فوج
عربوں کو پے در پے نقصان پہنچا رہی تھی کہ اچانک داہر کا ہاتھی زخمی ہو گیا۔ راجہ داہر
نے ہاتھی سے چھلانگ لگا کر ایک گھوڑے پر سوار ہو کر لڑنا شروع کر دیا مگر فوج راجہ کا
زخمی ہاتھی فرار ہوتے دیکھ کر سمجھی کہ راجہ مارا گیا ہے، اور پنجابی فوج میں افراتفری مچ
گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب جنگ جیت گئے۔ راجا داہر نے عربوں کا ڈٹ کر
مقابلہ کیا اور آخری سانس تک لڑتا رہا۔ راجا کی ملکہ رانی بائی نے
پندرہ ہزار پنجابی عورتوں کے ساتھ مل کر خود کو قلعہ میں بند کر لیا
اور عربوں پر تیروں اور پتھروں کی برسات کر دی لیکن جب دیکھا
کہ مقابلہ ممکن نہیں تو عربوں کی کنیزیں بننے کی بجائے سب نے مل
کر خود کو آگ لگا ڈالی۔ داہر کی دوسری چھوٹی رانی، رانی لاڈی نے
البتہ خود کو آگ نہ لگائی اور محمد بن قاسم نے اس سے شادی کر
لی۔

ملتان میں بھی سخت مقابلہ رہا اور پنجابی افواج نے ڈٹ کر
عربوں کا مقابلہ کیا۔ یہاں بھی ایک غدار نے شہر کے خفیہ چشمے کی
نشاندہی کر دی جس پر عربوں نے قبضہ کر لیا ۔ پانی کی کمی کی وجہ سے

پنجابی بچے تڑپ تڑپ کر مرنے ل گے اور چار و ناچار پنجابیوں کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔

انگریز نے جب پنجاب پر قبضہ کر لیا تو پنجاب کو نیچا دکھانے کے لیے اس کی تاریخ مسخ کر دی۔ ہر اچھی بات چھپا کر ہر بری بات کو بڑھا کر بیان کیا۔ حالانکہ اب انگریزی زبان میں جو تاریخ لکھی جا رہی ہے اس کا رنگ کچھ اور ہی ہے لیکن ہمیں یہ بھی گوارا نہیں کہ ہم نے تحقیق تو نہیں کرنی کم از کم وہ کتابیں ہی پڑھ لیں۔

محمود غزنوی کے بارے میں اس طرح لکھا جاتا رہا ہے جیسے وہ سیر سپاٹا کرنے آتا تھا اور ہندوستانیوں کو مار کر چلا جاتا تھا۔ غزنوی ایک زبردست جرنیل تھا اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں پر اُس نے سترہ حملے کیے ۔ 1008ء کے حملے میں پنجاب کے راجا انند پال نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پنجابیوں نے افغانیوں سے ایسی جنگ لڑی کہ وہ بھاگنے کا سوچنے لگے مگر بد قسمتی سے راجا انند پال کا ہاتھی عین وقت پر بِدک گیا جس سے پنجابی ہار گئے ۔ لیکن اس جنگ میں ہونے والے نقصان سے افغانیوں کو پنجابیوں پر اتنا غصہ تھا کہ وہ لگاتار تین دن تک پنجابیوں کا قتل عام کرتے رہے۔ 1024ء میں جب غزنوی سومناتھ کا مندر لوٹ کر جا رہا تھا تب بھی پنجابیوں نے

افغان فوج پر دھاوا بول دیا اور انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس سے اگلے سال غزنوی بڑی فوج کے ساتھ پنجابیوں سے بدلہ لینے آیا اور پنجابی جاٹوں کو مار مار کر خون کی نہریں بہا دیں۔

پنجابی قوم کبھی بھی چین سے نہیں بیٹھی۔ ہوتا یوں ہے کہ تاریخ کی کتب میں ان کے خون کا ذکر یوں کیا جاتا ہے جس طرح مکھی مرنے کی بات ہو۔ پورے مغل دور میں پنجابی جاٹ مغلوں کے ساتھ لڑتے رہے۔ انہوں نے کبھی بھی مغلوں کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ جب مغل بادشاہ فرخ سیار کے دور میں جاٹوں نے بغاوت کر دی تو 1715ء میں سارے ہندوستان کی افواج پنجاب پر چڑھ دوڑیں۔ فوج نے بندا سنگھ بہادر پنجابی کو مارا اور پنجاب کو مغلوں کو آگے سر نہ جھکانے کی سزا بھی سنائی۔ اس سزا کے طور پر مغل فوج نے پنجابیوں کا قتل عام کیا اور بے شمار پنجابی جاٹ مار ڈالے۔

1761ء میں جب مرہٹوں کے خلاف پانی پت کی تیسری جنگ جیتنے والے احمد شاہ ابدالی کا ڈنکا بج رہا تھا تو پنجابیوں نے اُس کی شاندار سلطنت کے خلاف اودھم مچا رکھا تھا۔ ابدالی کی فوج بہت بڑی تھی ۔ مغلوں کی فوج پنجابیوں کے لیے نہ لڑتی تھی اس لیے پنجابیوں کو خود ہی افغانیوں سے لڑنا پڑتا۔ 1761ء میں ایک بار پھر پنجابی لڑ پڑے اور کسی بھی افغان جرنیل کے ہاتھ نہ آئے ۔ مجبوراً

1762ء میں احمد شاہ ابدالی کو خود لاہور آکر پنجابیوں کے ساتھ لڑنا پڑا لیکن پورا سال لڑنے کے باوجود پنجابیوں کو ہرا نہ سکا اور واپس افغانستان لوٹ گیا۔

جب رنجیت سنگھ نے اپنے گوجرانوالوی جرنیل ہری سنگھ نلوا کو پشاور فتح کرنے کے لیے بھیجا تو پٹھان بنا لڑے ہی بھاگ نکلے۔ پنجابیوں کا اس قدر خوف پھیلا کہ افغانی مائیں بچوں کو یہ کہہ کر ڈراتی تھیں کہ سو جاو ورنہ ہریہ آجائے گا۔ رنجیت کا بیٹا کھڑک سنگھ تو بیماری سے مر گیا لیکن جب اس کا بیٹا نونہال سنگھ چھت گرنے سے چل بسا تو پنجاب کی راجدھانی کمزور پڑ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ 1845ء کی جنگ پنجابی انگریزوں سے ہار گئے لیکن ایسا مقابلہ کیا کہ یہ ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے خونی جنگ ثابت ہوئی۔

تاریخ کو روشن دماغ کے ساتھ کھنگالیں تو ماضی کے رنگ بدلتے جاتے ہیں۔ ہمارے آباء کی ارواح بین کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں کہ ہم کیا تھے اور کیا بنا کر پیش کیے جاتے ہیں؟ اب کیا کہیں کہ کیوں پنجابی کبھی نہیں لڑتا؟ کتنا بے غیرت ہے؟ جب بھی کسی نے باہر سے حملہ کیا اس نے سر تسلیم خم کر کے ،جی حضوری شروع کر دی؟

6

ثقافت

دنیا کی مختلف قوموں کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو پتا چلتا ہے
کہ کوئی قوم پانچ سو برس پہلے تک جنگلی تھی، کوئی ہزار اور کوئی دو
ہزار سال پہلے تک ۔ بہت کم اقوام ایسی ہیں جو دو ہزار سال پہلے بھی
باشعور ہو چکی تھیں اور علم و ادب اور فن کی طرف مائل تھیں۔
آج سے پانچ ہزار سال قبل تین اقوام ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔ ایک
مصر کی قوم، دوسری بابل و نینوا کی قوم اور تیسری ہڑپہ کی قوم جو
دریائے سندھ کی سرزمین پر آباد تھی ۔اس وقت پنجاب، س پت سندھو
یعنی سات دریاؤں کا دیس کہلایا جاتا تھا۔ اتنے ہزار برس پہلے بھی
علم و ادب سے لگاؤ کی وجہ سے پنجابی ذہن شعور کی حد میں بہت

ترقی کر چکا تھا۔ پنجابی اذہان کے لیے زندگی کا مقصد صرف زندہ رہنا
نہیں بلکہ زندگی سے لطف اٹھا کر، اس کا شکر ادا کر کے، خوشی اور
جشن منانا تھا اس لیے پنجاب کے لوگ ہر بات پر میلے لگا کر ناچنے
گانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ موسم کے بدلنے کی بھی خوشیاں منائی
جاتی ہیں۔ ویسے پنجاب میں موسم بھی کافی ہیں۔ پنجاب میں کم از کم
پانچ موسم ہیں، یعنی ہر ستر دن بعد موسم بدل جاتا ہے۔ بہار کے
بعد گرمی۔ گرمی ختم ہو تو برسات پھر خزاں اور آخر میں سردی۔ ہر
موسم کی آمد پر خوشیاں منائی جاتی ہیں، گیت گائے جاتے ہیں۔ ہر
بات کو بہانہ بنا کر خوشی منانا پنجاب کی روایت ہے۔

نئے سال کے پہلے دن بیساکھی کا میلہ ہوتا ہے جو اپریل
کا وسط بنتا ہے۔ اس دن سال کی پہلی فصل کی کٹائی ہوتی ہے۔ لوگ
نئے کپڑے پہنتے ہیں، کھاتے ہیں، بھنگڑے ڈال کر خوشیاں مناتے
ہیں۔ تیان، برسات کا میلہ ہے جو اگست کے وسط میں آتا ہے۔ یہ
پہلی بھادوں کو منایا جاتا ہے۔ عورتیں نئے کپڑے پہنتی ہیں، گِدھا
ڈالتی اور جھولے جھولتی ہیں۔ ملن کے گیت گاتی ہیں۔ لوہڑی کا میلہ،
پہلے ماگھ کو منایا جاتا ہے جو جنوری کے وسط میں آتا ہے۔ کہا جاتا
ہے کہ یہ سال کا سب سے ٹھنڈا دن ہوتا ہے اور اس کے بعد
سال کے بڑے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ بڑا الاؤ جلا کر اس میں

اناج پھینکا جاتا ہے اور اس کے گرد ناچ گانا ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس دن دُلے بھٹی نے دو ہندو لڑکیوں، سندری اور مندری کو مغل فوج سے بچایا تھا۔ آگ میں سردیوں کا اناج جیسے گڑ، گچک اور تِل وغیرہ بھی ڈالے جاتے ہیں۔ یہی اناج لوگ آپس میں بانٹتے بھی ہیں۔ مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ وغیرہ بھی کھایا جاتا ہے۔ فروری کے وسط میں آتا ہے پھگن جس میں بسنت بہار کا میلہ لگایا جاتا ہے۔ پیلے کپڑے پہن کر ناچ گانا ہوتا ہے اور پتنگیں اڑائی جاتی ہیں۔

پنجاب میں عورتوں کا لباس شلوار قمیض اور دوپٹہ ہے۔ شادی بیاہ اور خاص موقعوں پر غرارہ بھی پہنا جاتا ہے۔ شلوار یا سُتھن پنجابی عورت کا روایتی پہناوا ہے۔ خاص موقعوں پر گھاگرا بھی پہنا جاتا ہے۔ دوپٹے کی جگہ سر پر پھلکاری لی جاتی ہے، جو ایک چوکور کپڑا ہوتا ہے جس پر کڑھائی کی گئی ہوتی ہے۔ پھر کرتا یا چھوٹی کُرتی اور سُتھن۔ باہر جانے یا خاص مواقع کے لیے سُتھن پر گھاگرا جو لہنگے جیسا ہوتا ہے۔ مرد تو اب شلوار قمیض بھی چھوڑتے چلے جا رہے ہیں، گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے۔ ویسے مرد دھوتی کُرتا پہنتے تھے۔ ثقافت وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے اور بدلتی رہنی چاہیے لیکن یہ بدلاؤ اپنی پرانی ثقافت میں ہونا چاہیے۔ اپنی ثقافت کو چھوڑ کر کوئی دوسری

ثقافت اپنالیناز ندہ اقوام کا شیوہ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ پنجابی کوئی علیحدہ زبان نہیں لگتی یہ تو اردو کی ہی ایک شکل ہے۔ کوئی اور اگر یہی بات کرے تو انسان بر داشت کر بھی لے، لیکن پنجابی خود یہی بات کرتے ہیں تو دل دُکھتا ہے۔

انگریز جب ہندوستان پر قابض ہوئے تو آخری حصہ جس پر انھوں نے قبضہ کیا وہ پنجاب تھا ۔ لیکن مسلمانوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو انہوں نے شروعات پنجاب سے کی۔ عربوں نے بھی اور وسط ایشیائی اقوام نے بھی۔ عربوں کے پنجاب پر قبضہ کرنے سے پنجاب کی ثقافت پر کوئی اثر نہ پڑا کیونکہ عرب نہایت کم تعداد میں یہاں رہے اور اپنی حکومت بھی نہ سنبھال پائے جو آہستہ آہستہ پنجابیوں نے واپس چھین لی تھی۔

وسط ایشیا کے مسلمانوں نے ہندوستان پر قبضے کا آغاز سلطان محمود غزنوی کے ساتھ بارہویں صدی عیسوی کے شروع میں کیا۔ غزنویوں نے ہندوستان پر حملے تو بہت کیے لیکن قبضہ صرف پنجاب پر کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی لڑنے سے گھبراتا تھا اور اپنے ملک کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ جو غزنوی ہندوستان کے کسی اور علاقہ پر قبضہ نہ کر سکا اس نے پنجاب پر قبضہ کر لیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب نے کوئی مزاحمت نہ

کی اور اس نے آرام سے پنجابیوں کو زیر کر لیا۔ پھر وہی بات کہ بات تو لطف لینے والی ہے لیکن جب پنجابی ہی یہ بات کرتے ہیں تو دل دُکھتا ہے۔ تاریخ میں یہ بات پوشیدہ نہیں کہ غزنوی ہندوستان کو کبھی بھی اپنی سلطنت میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خواب تھا کہ وہ وسط ایشیا میں ایک عظیم سلطنت بنائے جو اس نے بنا بھی لی۔ ہندوستان پر حملے وہ یہاں سے سونا اور چاندی لوٹنے کے لیے کرتا تھا کیونکہ افغانی غزنویوں کے لیے ہندوستان کی گرمی برداشت کرنا مشکل تھا اور سردیوں میں وسط ایشیا کی برف کی وجہ سے وہاں لڑنا مشکل تھا۔ اس لیے گرمیوں میں وہ وسط ایشیا کے علاقوں پر حملے کرتا تھا اور سردیوں میں ہندوستان پر۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان پہاڑی سلسلے کا نام ہندوکش اس لیے پڑا کہ جب غزنوی ہندوستانیوں کو غلام بنا کر لے جاتا تھا تو وہ یہاں کی سردی برداشت نہ کر پاتے اور رستے میں ہی ہلاک ہو جاتے تھے۔

پنجاب کا سب سے پرانا نام سمہ دوار، بڑا دروازہ ، اسی لیے تھا کہ افغانستان یا وسط ایشیا سے ہندوستان میں داخل ہونے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا پنجاب۔ اس لیے غزنوی جب بھی ہندوستان پر حملے کے لیے آتا تھا اسے پنجاب میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ غزنوی کی اتنی بڑی سلطنت اور فوج ہونے کے باوجود پنجابی ہر بار اس

کے مقابل کھڑے ہو جاتے تھے ،اس نے پنجاب پر مجبوراً قبضہ کر کے اپنی فوج یہاں رکھ چھوڑی تھی۔ غزنویوں نے پنجاب پر ڈیڑھ سو سال حکومت کی۔ پنجابی نسل کی غزنوی قدر کرتے تھے کیونکہ پنجابی دلیر بھی تھے اور لڑتے بھی بہت اچھا تھے۔ آہستہ آہستہ غزنویوں کی فوج میں پنجابی بھرتی ہونا شروع ہو گئے اور وقت کے ساتھ غزنوی فوج میں پنجابی کافی تعداد میں شامل ہو گئے۔

غزنوی ترکی بولتے تھے اور فارسی ان کی درباری زبان تھی۔ یہ زبانیں پنجابی میں گھل مل گئیں اور ا یک نئی زبان نے جنم لیا۔ پنجابی سپاہی اب غزنوی فوج کا لازمی جزو تھے اور غزنوی کے بعد غوری، خاندان غلاماں، لودھی پنجاب سے آگے ہندوستان میں بڑھتے گئے۔ پنجابی فوجیں بھی وہاں جاتی تھیں چنانچہ یہ ملی جلی زبان دکن تک جا پہنچی۔ آہستہ آہستہ اس میں فارسی کے محاورے اور کہاوتیں ملتی گئیں۔ پھر اس زبان میں سے پنجابی زبان کے الفاظ نکال کر ایک نئی ترکیب سے زبان بنائی گئی جو اردو زبان بن گئی۔ اس کے بعد اس زبان کو دیوناگری رسم الخط دیا گیا جس سے یہ ہندی زبان بن گئی۔ اس لیے یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ پنجابی اور اردو زبانیں ملتی جلتی ہیں لیکن یہ ملتی جلتی اس لیے ہیں کہ اردو بھی پنجابی ہی کی ایک شاخ ہے۔

پھر اس کے بعد قدرت کا پہیہ اُلٹا چلا۔ انگریزوں نے جب 1849ء میں پنجاب پر قبضہ کیا تو اس کی فوج میں اردو بولنے والے بہت سے لوگ تھے۔ بعد میں جب 1857ء میں وادیٔ گنگا سے آنے والے ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی تو پنجابیوں نے انگریزوں کی طرف سے لڑ کر انگریزوں کا دل جیت لیا۔

لیکن اس وقت 1849ء میں انگریز پنجابیوں سے کافی ناراض تھے کیونکہ پورے ہندوستان میں انگریزوں پر سب سے زیادہ ضرب پنجابیوں نے ہی لگائی تھی اس لیے پنجاب پر قبضہ کرتے ہی انگریزوں نے سارے انتظامی عہدے اردو بولنے والوں کے دے دیئے جنہوں نے پنجابی کی جگہ اردو کو پنجاب کے مدارس میں رائج کر دیا۔ اس کے بعد آج تک پنجابی زبان پنجاب کے مدارس میں داخل نہ ہو سکی۔

ہندو مذہب کی بنیاد پنجاب میں رکھی گئی تھی۔ آریاؤں نے ہندو مذہب کی سب سے پہلی کتاب رگ وید پنجاب میں رہتے ہوئے ہی لکھی۔ ہندو مذہب نے پنجابی مذہب سے بہت سے دیوی دیوتا رسمیں اور روایات لیں لیکن آریاؤں کے ہندو مذہب اور پنجابی مذہب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پنجابیوں نے کبھی ہندو مذہب کو قبول نہیں کیا۔ اس بات کی شکایت آریا پنڈتوں نے رگ وید میں بھی کی

ہے۔ پنجاب کے لوگ معبودیت پر نہیں بلکہ شکر اور تقدیر پر ایمان رکھتے تھے اس لیے ان کے لیے کوئی ایسا خدا نہیں تھا جو ان پر نگرانی کر رہا ہو تاکہ جب کوئی بندہ خدا کی مرضی کے خلاف جائے تو فوراً خدا اس کا نام جنت کے رجسٹر سے نکال کر دوزخ کے رجسٹر میں ڈال دے۔

پنجابیوں کا مذہب تھا زندگی کا جشن۔ وہ ہر طرح زندگی کی قدر کرنے والے تھے اور ہر اس شے کی قدر کرتے تھے جو زندگی کو آگے لے جاتی ہے۔ اسی لیے سورج، زمین، دریا، درخت وغیرہ کی تصویریں بناتے اور ان کی تعریف میں گیت گاتے۔ ان کی ارتھی اتارتے اور ان کے آگے ہاتھ جوڑتے، سجدے کرتے لیکن اس کا مطلب ان کی عبادت نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ وہ ان سب کی قدر کرتے تھے اور گیت گانا اور سجدہ کرنا شکر ادا کرنے کا ایک انداز تھا۔

پنجابی کے پاؤں ہی نہیں بلکہ اس کا دل بھی ڈھول کی تھاپ پر تھرکنا شروع کر دیتا ہے۔ دھمال اور گیت پنجاب کی روح ہے۔ سنگیت کے بغیر پنجابی کی زندگی بے رنگ ہے۔ پنجابی جتنا دلیر ہے اتنا ہی نرم دل ہے۔ جبکہ دوسرے لوگ خدا کو جانوروں کی قربانی دے کر خوش کرتے ہیں، پنجابی خدا کو ناچ کر منانا چاہتا ہے۔ کبھی باجوں پر قوالیاں گاتا ہے اور کبھی پاؤں میں گھنگرو باندھ کر دھمال ڈالتا

ہے۔

ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ میں ڈونگریا کونڈھ قبیلے کے لوگ نیام گری پہاڑ کو مقدس مانتے ہیں اور ایک طرح سے پوجتے ہی ہیں۔ یہ پوجا جہالت نہیں بلکہ اس بات کا اعتراف ہے کہ اس پہاڑ نے ہی وہاں کی وادی، جانوروں اور پانی کا نظام بنا کر رکھا ہوا ہے جس نظام پر ان خانہ بدوشوں کی زندگیوں کا دارومدار ہے۔ یہ شعور ہزاروں سالوں سے موجود ہے جو گزشتہ کچھ صدیوں سے صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری کے لالچ نے دبا دیا تھا لیکن اب پھر آہستہ آہستہ دنیا میں پرورش پا رہا ہے اور دنیا ماحولیات کے قدرتی نظام کو انسانی زندگی کے لیے ضروری قرار دے رہی ہے۔

یہی شعور پنجابیوں کو ہزاروں سالوں سے تھا۔ انہیں یہ احساس تھا کہ وہ اپنی زمین کا حصہ ہیں جہاں زندگی کا ایک ہی چکر چلتا ہے۔ یہ چکر زمین سے نکل کر درختوں اور جانوروں سے ہوتا ہوا خود ان تک پہنچ جاتا ہے اور پھر زمین تک ہی پہنچ جاتا ہے ۔ اسی لیے ہڑپہ کی سب سے بڑی اور مقدس دیوی دھرتی ماں یعنی زمین تھی اور ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ چکر سندھ کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس لیے سندھ ان کی زندگی کے ہر رنگ میں بستا تھا خواہ وہ پاکیزگی ہو، لوک داستانیں ہوں خدا کا عذاب یا پھر

رب کی نعمت اور اظہارِ فن ہو۔

قوموں کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ قوموں کی ثقافت بھی بدلتی رہتی ہے۔ ثقافت زمین کی آب و ہوا ، سماج میں سیاسی قوت ، معاشی نظام ، مذہب اور علم و ادب کی جڑوں سے پنپتی ہے۔ دوسری قوموں کے ساتھ میل جول رکھنا بھی ثقافت کی ترقی کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

قبیلہ تب بنتا ہے جب لوگوں کے آباء واجداد ایک ہوں۔ بہت سارے قبائل مل کر ایک قوم تب بناتے ہیں جب ان کی ثقافت ایک ہو۔ ثقافت میں لوگوں کی بود و باش کا طریقہ بھی ایک ہوتا ہے اور لوگوں کے سوچنے کا انداز بھی۔ لوگ کھاتے پیتے کیا اور کس طرح ہیں۔ کمزور سے چھین لینے کو بہادری سمجھتے ہیں یا طاقتور کی زیادتی کا مقابلہ کرنے کو ، دنیا کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹنا چاہتے ہیں یا اُسے زندگی بخش نظام سمجھ کر اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔

جب دنیا کو دیکھنے کی بات ہو تو یہ بات بھی آجاتی ہے کہ یہ قوم خود کو کس طرح دیکھتی ہے؟ خود کو دیکھنے کا مطلب ہے کہ وہ تاریخ میں کیا تھی؟ اب کیا ہے؟ اور آگے کیا کرنا چاہتی ہے؟ شناخت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کوئی قوم اتنی باشعور ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا کو ایک قوم کی نظر سے دیکھنے لگے تو وہ دنیا کے

ساتھ اپنا رشتہ بنانے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ دنیا میں اپنی شناخت بنانے کے لیے قومیں اپنی ثقافت کی پہچان کراتی ہیں۔ پہچان بھی کراتی ہیں اور ان کا انتخاب بھی کرتی ہیں۔ جس طرح ایک بچے کی شناخت اس کا خاندان ہوتا ہے، قوم کی شناخت اس کا ورثہ ہوتی ہے۔

ورثہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جو قوم کی ایک نسل، آگے آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ کر جاتی ہیں ۔ جو وراثت قدرت سے ملتی ہے جیسے میدان، پہاڑ، دریا یا سمندر یا ریگستان وغیرہ انہیں قدرتی ورثہ کہتے ہیں اور جو ثقافت ہمارے آباء ہمارے لیے چھوڑ کر جاتے ہیں وہ ثقافتی ورثہ کہلاتا ہے۔

ثقافتی ورثہ کوئی بھی شے ہو سکتی ہے جیسے کہ مورت یا عمارت، یا خیال اور آئیڈیا، کپڑے کا ڈیزائن یا غیرت کا معیار۔ روایتیں بھی ثقافتی ورثے کا اہم حصہ ہوتی ہیں۔

ایک قوم کی معاشرتی اقدار بھی اس کی ثقافت کا حصہ ہوتی ہیں۔ قوم کی تاریخ سے یہ پتا چلتا ہے کہ کسی قوم نے کوئی قدر کیوں اپنائی اور اس کی کیا اہمیت ہے؟

روایات کے ساتھ تاریخ بھی قوم کے ثقافتی ورثے کا اہم حصہ ہوتی ہے۔ قوم کی شناخت کے معاملے میں تاریخ اور روایات

گھل مل جاتی ہیں۔ قوم کس زمین کی ہے؟ اس کا رہن سہن، کھانا پینا کیسا ہے؟ وہ خدا کو قربانی دے کر راضی کرتی ہے یا ناچ گانا کر کے؟ اس قوم کے ہیرو اپنے تھے یا باہر سے آئے تھے؟ وہ لوٹ مار کرنے والی قوم ہے یا فن و ادب پیدا کرنے والی؟ یہ ساری باتیں ایک قوم کو اس کی شناخت دیتی ہیں۔ یہ سب باتیں قوم کو اس کی روایات بتاتی ہیں۔ تاریخ وہ ماضی ہوتا ہے جو قوم پر بیتا ہوتا ہے۔ اصل میں تو قوم کی تاریخ اور روایات ایک سی ہونی چاہئیں لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ قومیں اپنی شناخت بنانے کے لیے کئی مرتبہ تاریخ کے کچھ حصے بھلا دیتی ہیں اور کچھ نئی روایات گھڑ لیتی ہیں جو تاریخ کو کھا جاتی ہیں۔

جب کوئی قوم اپنی غیر حقیقی شناخت بنانے کی کوشش کرے تو اُسے اپنی تاریخ بدلنا پڑتی ہے اور کچھ روایات کو چھپا کر نئی روایات بنانی پڑتی ہیں۔ کئی جنگیں، جو ہاری ہوئی ہوتی ہیں وہ تاریخ اور جھوٹی روایات کے ملاپ سے جیت میں تبدیل کر دی جاتی تھیں۔ ہم نے بھی اپنی تاریخ کے ساتھ یہ کھلواڑ کیے ہوئے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی، افغانی بادشاہ ، جس نے ہندوستان پر تقریباً دس حملے کیے ہمیشہ لوٹ کھسوٹ کی۔ پنجاب کا تو اتنا برا حال کیا کہ یہاں محاورہ بن گیا، 'کھادا پیتا لاہے دا، باقی احمد شاہے دا' (جو کچھ کھا لو گے اور پہن لو گے وہی

تمہارا ہے، باقی سب کچھ احمد شاہ ابدالی لوٹ کر لے جائے گا) ۔اور ایک بادشاہ تھا پنجاب کا، رنجیت سنگھ۔اس نے پنجاب کو ایک عرصے بعد ہندوستان سے الگ کیا ، پنجاب کی اپنی راجدھانی بنائی اور انگریز کو دبا کر رکھا۔ مسلمان، ہندو میں کبھی فرق نہیں کیا لیکن آج ہمارا ہیرو افغانی لٹیرا احمد شاہ ابدالی ہے اور ولن ہمارے آباء کا پیارا رنجیت سنگھ پنجابی ہے۔

جھوٹی روایات گھڑنے کے علاوہ بھی اقوام اپنی شناخت بدلنے کے لیے اپنی روایات اور اپنے ورثے سے کھلواڑ کرتی رہتی ہیں۔ مندر اور کھنڈر تباہ ہونے کے لیے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ کٹاس راج سے لے کر جین مندر جیسے ہزاروں مندر ہیں جنہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ہڑپہ، ٹیکسلا اور موہنجو داڑو کے کھنڈرات تباہ ہو گئے ہیں لیکن پنجاب میں انہیں قبول کرنے کو کوئی تیار نہیں۔ ہم اپنی شناخت پنجاب کے ورثے میں چھوڑ کر عربوں کے ورثے میں ڈھونڈتے ہیں۔

ورثہ اور ثقافت قوم کو شناخت دیتے ہیں۔ قوم اور قبائل میں واضح فرق یہی ہوتا ہے کہ قوم میں کئی نسلیں، کئی بولیاں اور کئی مذاہب جبکہ قبیلے میں ایک ہی مذہب، ایک ہی نسل اور ایک ہی بولی چلتی رہتی ہے۔ قبیلے کا ورثہ اور ثقافت ایک ہی ہوتی ہے جبکہ قوم کا ورثہ اور ثقافت مختلف گروہوں کے ورثوں اور ثقافتوں کا ایک

گلدستہ ہوتا ہے۔

ہر قوم میں بیک وقت کئی ثقافتیں چل رہی ہوتی ہیں۔ امراء کی، غرباء کی، شہروں کی، دیہاتوں کی، بیوپاریوں کی، پروفیشنلز کی، جدا جدا مذاہب کے ماننے والوں کی، علیحدہ جگہوں پر رہنے والوں کی وغیرہ۔ کسی بھی ایک جماعت کی ثقافت کو لے کر پوری قوم پر تھوپا نہیں جاسکتا۔

ہندوستان میں یہ ہوا کہ یہاں نہ ایک سماج تھا نہ ایک قوم ۔ یہ تو قوموں کا گلدستہ تھا جن میں سے پنجابی قوم ایک گلاب جیسی تھی اور ایسے ہی آگے ہر قوم کی علیحدہ علیحدہ گروہی ثقافتیں تھیں۔ سوائے چندر گپت موریا اور اکبر اعظم جیسے بادشاہوں کے وقت کے یہ ساری اقوام کبھی بھی اکٹھی نہ ہوئیں۔ ایک سیاسی نظام میں بھی نہیں۔ ہمیشہ سے علیحدہ علیحدہ قومیں اپنے علیحدہ دیسوں میں بستی تھیں اور ان میں سے ایک پنجابی تھے۔

جب انگریزوں نے ہندوستان کی ساری ریاستوں پر اور ساری اقوام پر سیاسی فتح حاصل کر لی تو ان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان اقوام کو سمجھ کر ان کی پالیسیاں مرتب کی جائیں جن سے یہ قابو میں رہیں۔

جہانگیر کے دور میں انگریز ہندوستان آئے تو کم و بیش پورا

ہندوستان ایک مغل بادشاہ کا ہی دیس تھا۔ پھر جب خود انگریز
ہندوستان پر قابض ہو گئے تو یہ تھیوری پکی ہو گئی۔ اس تھیوری کے
حق میں جو بھی چیز پائی وہ رکھ لی اور جو خلاف ہوئی اُسے ایک
طرف کر دیا۔ اس طرح انگریز تاریخ دانوں نے اپنی کالونی کی ایک
تاریخ مرتب کر دی جس میں سارا ہندوستان ایک دیس تھا جس میں
ایک ہی قوم آباد تھی، جس کی ایک ہی ثقافت تھی۔ انگریز تھیوری
کے مطابق اس ایک دیس میں بعد میں مسلمان قوم آکر آباد ہو
گئی۔ اس طرح انگریزوں کے حساب سے آٹھویں صدی عیسوی کے
بعد ہندوستان ایک ایسا ملک بن گیا جہاں دو قوموں کی علیحدہ علیحدہ
ثقافت تھی۔ موجودہ تاریخ کے سماجی علم کے فلسفے کے مطابق
انگریزوں کی یہ ڈیڑھ سو سال پرانی تھیوری تقریباً جاہلانہ تھی لیکن ہم
آج بھی وہی تھیوری پڑھتے آرہے ہیں اور اُسی عینک سے اپنا ماضی
دیکھتے آئے ہیں۔

7

جلیانوالہ باغ

انگریز سرکار کو خطرہ تھا کہ پہلی جنگ عظیم (1914ء تا 1918ء) کے دوران کہیں ہندوستانی اس کے خلاف بغاوت نہ کر دیں مگر گاندھی سمیت بہت سارے بڑے ہندوستانی لیڈروں نے جنگ کے دوران انگریز سرکار کا ساتھ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں انگریز سرکار کا ساتھ دینے سے اور ہندوستانیوں کو انگریز فوج میں شامل ہو کر جرمنوں، اطالویوں اور جاپانیوں کے خلاف لڑنے کی ترغیب دینے کے انعام کے طور پر جنگ جیتنے کے بعد انگریز سرکار ہندوستان کو بھی ڈومینیئن قرار دے کر اسی طرح تقریباً آزاد کر دے گی جس طرح وہ کینیڈا اور آسٹریلیا کو پہلے ہی کر چکی تھی۔

اس جنگ میں 13 لاکھ ہندوستانی انگریزوں کی طرف سے

لڑے جن میں سے پچاس ہزار مارے گئے اور ستر ہزار زخمی ہوئے ۔
مگر جب جنگ ختم ہوئی تو انگریز سرکار نے ہندوستان کو آزاد کرنے
سے انکار کر دیا۔ اس لیے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے بیچ تناؤ
بڑھنے لگا اور انگریز سرکار کے برتاؤ میں بھی واضح تبدیلیاں آنے
لگیں۔

جنگ میں ہندوستان کی معیشت تباہ ہو چکی تھی اور ہر طرف
مہنگائی اور بیروزگاری کا طوفان تھا۔ 1918ء میں دنیا بھر میں سپینش
فلو کی جان لیوا وباء پھیل گئی جس سے دس کروڑ لوگ مارے گئے۔
ہندوستان میں اس بیماری سے دو کروڑ کے قریب لوگ موت کے
گھاٹ اتر گئے، جس کی وجہ سے سارے ہندوستان میں افراتفری سی
پڑی ہوئی تھی۔

1919ء میں انگریز سرکار کے سلطنت عثمانیہ کو توڑنے کی
وجہ سے ہندوستانی مسلمان ناراض تھے اور تحریک خلافت کی شروعات
تھی۔

امریکہ میں پنجابیوں نے غدر پارٹی بنائی اور 1915ء میں
ہندوستان کو آزاد کروانے کے لیے بغاوت کا پلان بنایا۔ بغاوت کی یہ
کوشش پکڑی گئی۔ انگریز سرکار نے باغیوں کو سزائیں دینے کے لیے
ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ 1915ء لاگو کیا جس کے تحت جنگ کے

دوران کسی کو بھی بغیر وارنٹ کے گرفتار اور بغیر مقدمے کے سزا
دی جاسکتی تھی۔ اس کالے قانون کے تحت غدر پارٹی کے پکڑے
گئے لوگوں کو ایک ٹریبونل نے لاہور 'کونسپائریسی' (سازش) کیس میں
سزائیں دیں۔ 42 بندوں کو پھانسی لگادیا اور 114 کو عمر قید کی سزا
سنائی۔ غدر پارٹی کی بغاوت کی کوشش کے بعد انگریز سرکار نے
انگلستانی ہائی کورٹ کے ایک جج سڈنی رولٹ کی سربراہی میں ایک
کمیٹی بنائی جو رولٹ کمیٹی کہلائی۔ اس کمیٹی کا مقصد ہندوستان میں
بغاوت کی لہروں کے بارے میں شہادتیں اکٹھا کر کے سرکار کو
رپورٹ کرنا تھا۔

رولٹ کمیٹی نے رپورٹ دی کہ ہندوستان، خاص کر پنجاب
اور بنگال میں لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں اور جرمن حکومت ان کی
مدد کر رہی ہے۔ بغاوت کو روکنے کے لیے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ
1915ء جیسا قانون جنگ ختم ہونے کے بعد، امن کے دور کے لیے
بھی پاس کرنا چاہیے۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کی وجہ سے 18 مارچ
1919ء کو اینارکیکل اینڈ ریوولوشنری کرائمز ایکٹ 1919ء پاس ہوا جو
رولٹ ایکٹ کہلایا۔ اس قانون کی وجہ سے انگریز سرکار ہندوستان میں
کسی کو بھی بغیر وارنٹ گرفتار اور بغیر مقدمے کے سزا دے سکتی
تھی اور پریس پر بھی سنسر شپ لگا دی گئی۔ اس قانون کے خلاف

احتجاج کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے لیجسلیٹو کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔

6 فروری 1919ء کو مہاتما گاندھی نے بیس بڑے لوگوں کے ہمراہ، جن میں ہندو اور مسلمان سب ہی شامل تھے، اعلان کیا کہ اگر رولٹ قانون پاس ہو گیا تو وہ کوئی دنگا فساد تو نہیں کریں گے پر اس قانون کی کھلم کھلا خلاف ورزی ضرور کریں گے۔ 1857ء کے بعد یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ ہندوستانی عوام انگریز راج کو اس طرح دھڑلے سے للکار رہے تھے۔ پھر جب 18 مارچ 1919ء کو رولٹ قانون پاس ہو کر نافذ ہو گیا تو گاندھی نے 6 اپریل کو ملک گیر ہڑتال کی کال دے دی۔

1913ء سے لے کر 1919ء تک پنجاب کا گورنر مائیکل اڈوائر تھا۔ مائیکل اڈوائر نے 1885ء میں انڈین سول سروس میں کام شروع کیا اور 1919ء تک کا تقریباً سارا عرصہ پنجاب میں ہی رہا۔ مائیکل اڈوائر کے مطابق نہ تو ہندوستانی عوام میں حکومت کرنے کی صلاحیت تھی اور نہ ہی یہ ان کی مانگ تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ ہندوستانیوں کی طرف سے ہر طرح کے جلسے جلوسوں کو سختی سے کچل دینا چاہیے۔

گاندھی جی کی کال پر 6 اپریل کو لاہور میں ہڑتال کے

ساتھ رولٹ ایکٹ کے خلاف ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ پنجاب میں
دوسری جگہوں پر بھی جلسے جلوس ہوئے۔ یہ تمام جلسے پوری طرح
پرامن رہے اور اس بات کی اخباروں میں بہت تعریف بھی ہوئی -
مگر 7 اپریل کو پنجاب کے گورنر مائیکل اڈوائر کا بیان آیا کہ جب
اس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران پنجاب میں کوئی گڑبڑ نہیں ہونے
دی تو اب جنگ کے بعد وہ پنجاب میں کسی بھی قسم کی گڑبڑ
برداشت نہیں کرے گا۔

9 اپریل 1919ء کو لاہور میں رام نومی کا میلہ منایا گیا جس
میں بیس ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ اس میلے میں مسلمانوں نے
بھی بڑی تعداد میں شرکت کی اور انگریز سرکار کے خلاف اپنی ایکتا
کا پرچار کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ہی برتن میں
پانی بھی پیا اور اپنی پگڑیاں بھی ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل
کیں۔

30 رولٹ ایکٹ کے خلاف گاندھی کی کال پر امرتسر میں
مارچ کو کامیاب ہڑتال کی گئی تھی۔ اس دن تیس ہزار لوگوں کا
ایک جلسہ بھی ہوا جس کے لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر
ستیا پال تھے۔ ڈاکٹر کچلو بیرسٹر تھے اور انہوں نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ
کی ڈگری حاصل کر رکھی تھی، جب کہ ڈاکٹر ستیا پال ایک میڈیکل

ڈاکٹر تھے۔

6 اپریل کو امرتسر میں لاہور، گوجرانوالہ، پنڈی، حافظ آباد، بٹالہ، سیالکوٹ، جالندھر، لدھیانہ اور انبالہ کے ساتھ ایک بار پھر ہڑتال اور جلسے کیے گئے۔

پنجاب کا انگریز سرکار کے خلاف اتنا زوردار ردعمل دیکھ کر گاندھی جی نے پنجاب کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا، مگر مائیکل اڈوائر نے 9 اپریل کی رات کو انہیں دلی سے پیچھے ہی گرفتار کرواکر مال گاڑی کے ذریعے ممبئی بھجوادیا۔ 10 اپریل کی صبح مائیکل اڈوائر نے ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر سیتا پال کو امرتسر سے گرفتار کرواکر کسی نامعلوم جگہ بھجوادیا۔ ان گرفتاریوں کے خلاف 10 اپریل کو لاہور اور امرتسر میں اتنے بڑے جلسے ہوئے کہ مائیکل اڈوائر نے گھبرا کر پنجاب پولیس کو حکم دیا کہ اگر گڑبڑ روکنے کے لیے ان کو عوام پر گولی بھی چلانی پڑے تو وہ اس سے گریز نہ کریں۔ ان جلسوں کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں ہندو، مسلمان اور سکھ مل کر شرکت کر رہے تھے۔

لیڈروں کی گرفتاری کے غصے اور عوام کو قابو میں کرنے والے لیڈروں کے نہ ہونے کی وجہ سے 10 اپریل کے لاہور اور امرتسر کے جلسے پرامن نہ رہ سکے۔ امرتسر میں لوگوں نے بینکوں اور ریلوے سٹیشنوں پر حملے کرکے پانچ گورے مار ڈالے۔ پولیس

نے گولی چلادی جس سے کئی بندے مارے گئے اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ 11 اپریل 1919ء کو جمعہ کا دن تھا۔ لاہور کی بادشاہی مسجد میں پینیتیس ہزار لوگوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا، جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو اور سکھ بھی شامل تھے۔ 12 اپریل کو ملٹری نے لاہور میں گولی چلادی جس سے دس لوگ مارے گئے۔ 13 اپریل کو اتوار کا دن تھا اور بیساکھی کا میلہ۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں دس ہزار لوگ اکٹھے تھے۔ کچھ لوگ لیڈروں کے بلاوے پر سیاسی جلسہ کرنے آئے تھے مگر زیادہ تر بیساکھی منا رہے تھے، اس لیے باغ میں خواتین اور بچے بھی تھے۔

امرتسر کے انچارج بریگیڈیئر جنرل ریجینلڈ ڈائر نے امرتسر میں جلسوں پر پابندی لگائی ہوئی تھی۔ اسے جب جلیانوالہ باغ کے جلسے کی خبر ملی تو اس نے پنجابیوں کو سبق سکھانے کی ٹھانی۔

جلیانوالہ باغ شہر کے بیچ میں تھا، اس لیے چاروں طرف عمارات اور دیواروں کی وجہ سے بند تھا۔ باغ میں داخلے اور اخراج کا ایک ہی راستہ تھا۔ شام کے ساڑھے چار بجے جنرل ڈائر نے باغ کا یہ واحد راستہ بند کر دیا۔ اس کے ساتھ نوے گورکھے، سکھ اور مسلمان فوجی تھے۔ جنرل ڈائر نے آتے ہی نہتے لوگوں پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ فوجیوں کے پاس 1650 گولیاں تھیں جو انہوں نے دس

منٹوں کے اندر اندر چلا دیں۔ دس ہزار کا نہتا پابند سلاسل مجمع سامنے تھا، ایک بھی گولی ضائع نہ گئی۔ انگریز سرکار کے مطابق 379 مارے گئے اور ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے، جن میں مرد، خواتین اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی شامل تھے۔ اس قتل عام کے ساتھ ہی جنرل ڈائر نے کرفیو لگا دیا اور لوگوں کو لاشیں اٹھانے کی مہلت بھی نہ بخشی۔ رات بھر لاشوں کو گدھ اور کتے کھاتے رہے۔

14 اپریل کو جلیانوالہ باغ قتل عام کے خلاف گوجرانوالہ میں مظاہرے ہوئے جن پر مائیکل اڈوائر کے حکم پر ہوائی جہازوں سے بم گرائے گئے اور مشین گنوں سے گولیاں برسائی گئیں۔ بارہ لوگ مارے گئے اور درجنوں زخمی ہوئے۔ 16 اپریل کو پنجاب میں مظاہروں کی وجہ سے مارشل لاء لگا دیا گیا۔

ابھی انگریز سرکار کا غصہ نہیں اترا تھا۔ امرتسر شہر کی بجلی اور پانی کاٹ دیا گیا۔ ایک گلی، جہاں مظاہرین نے 10 اپریل کو مظاہروں کے دوران ایک انگریز خاتون پر حملہ کیا تھا، اس کے بارے میں آرڈر ہوا کہ اس گلی سے جو بھی ہندوستانی گزرے وہ دو سو گز تک کتوں کی طرح ہاتھوں پیروں پر چلتا ہوا جائے۔ گوجرانوالہ میں مارشل لاء نوٹس نمبر- 2 کے تحت آرڈر ہوا کہ جو بھی دکاندار سپاہیوں یا فوجیوں کو سودا دینے سے انکار کرے گا اس کو کوڑے

مارے جائیں گے۔ مارشل لاء نوٹس نمبر- 7 میں آرڈر ہوا کہ جو بھی
ہندوستانی کسی انگریز افسر کو دیکھے، فوراً کھڑا ہو کر اسے سلیوٹ
کرے۔ لاہور میں کالجوں کے طلباء کو آرڈر ہوا کہ وہ ہر روز میلوں
دور بنی ملٹری چوکیوں پر جا کر اپنی حاضریاں لگوائیں۔ سارے پنجاب
میں مارشل لاء عدالتوں نے درجنوں پنجابیوں کو مظاہروں، قتل عام
اور توڑ پھوڑ کے الزاموں پر قید اور موت کی سزائیں سنائیں۔

ان سارے مظالم سے مظاہرے تو رُک گئے، پر ہاہاکار اتنی
پڑی کہ مائیکل اڈوائر اور جنرل ڈائر، دونوں کو ہندوستان چھوڑ کر
انگلستان جانا پڑا۔ انگلستان میں جنرل ڈائر نے استعفیٰ دے دیا۔
انگلستان کی پارلیمنٹ نے جنرل ڈائر کے مستعفی ہونے کے بعد کسی اور
سزا کی مخالفت کر دی، پر جنرل ڈائر کے جلیانوالہ باغ قتل عام کو
غلط قرار دیا۔ انگریز افسروں اور عوام میں بہر حال جنرل ڈائر بہت
مقبول رہا، جن کا خیال تھا کہ جلیانوالہ قتل عام ہندوستان میں رہنے
والے انگریزوں کی حفاظت کے لیے بہت ضروری تھا۔ عوام نے چندہ
اکٹھا کر کے جنرل ڈائر کو چھبیس ہزار پاؤنڈ کی خطیر رقم دی، جو آج
کل کے دس کروڑ روپے سے بھی زیادہ بنتی ہے۔ اس چندہ مہم میں
مشہور انگریز ادیب رڈیارڈ کپلنگ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

دوسری طرف جلیانوالہ قتل عام میں مارے جانے والے

لوگوں کے وارثان کو انگریز سرکار نے پانچ سو روپیہ فی لاش کا معاوضہ دیا۔ اس پر بنگال کے نوبل انعام یافتہ ادیب رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنا "سر" کا خطاب انگریز سرکار کو واپس کر دیا۔

13 مارچ 1940ء کو پنجاب کے سپوت ادھم سنگھ نے لندن میں مائیکل اڈوائر کو گولیاں مار کر قتل کر دیا اور اپنی گرفتاری پیش کر دی۔ مقدمے میں ادھم سنگھ نے بیان دیا کہ اس نے مائیکل اڈوائر کو اس لیے مارا کہ اس نے جلیانوالہ باغ میں پنجابیوں کا قتل عام کیا تھا۔ ادھم سنگھ کو پھانسی دے دی گئی۔ ادھم سنگھ بھگت سنگھ کا پرستار اور غدر پارٹی کا ممبر تھا۔

8

آخری بات

واٹس ایپ پر ایک دوست نے مجھے ایک تصویر بھیجی۔ تصویر میں دن کے وقت ایک سڑک پر ایک گاڑی کھڑی تھی جس کی چھت پر ایک کتا ایک کتیا کی پشت پر اپنی اگلی ٹانگیں رکھ کر کھڑا تھا۔ یہ صاف بات تھی کہ اس تصویر میں ان کا پوز ایک جنسی عمل کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اسی دن کچھ ہی گھنٹوں میں مجھے یہ تصویر کئی اور دوستوں سے واٹس ایپ پر موصول ہوئی۔ میرے یہ سب دوست آپس میں دوست نہیں ہیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ تصویر سوشل میڈیا پر خاصی وائرل ہوئی تھی۔

تصویر دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ تصویر بھیجنے والے سارے ہی دوست تقریباً پچاس سال کے لگ بھگ ہیں۔ اولاد جوان ہے، یونیورسٹیوں میں پڑھتی ہے، اپنی بیویوں کے ساتھ رہتے ہیں،

پڑھے لکھے بھی ہیں۔ پھر آخر انہوں نے یہ تصویر مجھے کیوں بھیجی؟
تصویر کو میں نے غور سے دیکھا۔ ایک عام سا دن تھا، عام سی سڑک، عام سی گاڑی، عام سا کتا اور عام سی کتیا۔ کتوں کا پوز چاہے جنسی ہی تھا لیکن تھا عام ہی۔ میں نے سوچا کہ اس تصویر کی مقبولیت کی دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں کہ ایک تو کتا اور کتیا سرعام یہ جنسی عمل کر رہے ہیں اور دوسرا یہ کہ ان کی آپس میں شادی نہیں ہوئی۔

لیکن کیا یہ دونوں باتیں اس قابل تھیں کہ میرے دوست مجھے یہ تصویر بھیجتے؟ ادھیڑ عمر افراد جن کے پاس ان کی بیویاں بھی موجود تھیں ، ان کے لیے اس تصویر میں ایسی کیا خاص بات تھی؟ کوئی نوجوان لڑکے ہوتے تو بات بھی تھی۔ لڑکوں کے سامنے تو جنس کی کوئی بات کرو تو وہ گدھوں کی طرح یوں ہنسنے لگ جاتے ہیں جیسے انہیں گدگدی کر دی گئی ہو مگر میرے دوستوں کو یہ تصویر کیوں اچھی لگ رہی تھی؟

کچھ نسلوں سے ہم نے بڑھنا پوری طرح قدرت کے حوالے کر دیا ہے۔ کھا پی لیا کہ جسم نے جتنا بھی بڑھنا ہو بڑھ جائے۔ اسی طرح دماغی ظرف بھی قدرت پر چھوڑ دیا ہے۔ جب تک اور جتنا اپنے آپ بڑھ جائے، ٹھیک ہے ، ہم نے کوئی زحمت نہیں کرنی۔ سو جسم کے ساتھ یہ دماغ بھی اٹھارہ بیس سال تک ہی بڑا ہوتا ہے

اور اس کے بعد رُک جاتا ہے۔ اس لیے چاہے انسان پچاس برس کا
ہو یا پچاسی کا، اکثر دیکھتے ہیں کہ دماغی طور پر کھلنڈرا سا ہی ہوتا
ہے۔ گندے لطائف کا شوقین، بات بات پر ماں بہنوں کی گالیاں
دیتا اور سوائے مال وزر کے اور کوئی بات نہیں کر سکنے والا ۔ ظرف
کا بھی یہی حال ہے۔ جسے دیکھو دوسرے کا مال ہڑپنے، مزید مال و
زر جمع کرنے کے چکروں میں ہی رہتا ہے۔ اپنے ماضی پر نظر
دوڑائیں تو بزرگوں میں ہر طرف سیانے اور بڑے ظرف کے لوگ
بکھرے پڑے تھے۔ شرم آتی ہے ان کے بارے میں سوچ کر کہ
ہم کیا ہیں؟ بڑے عہدوں پر چھوٹے لوگ ہیں ہم۔

سوچی پیا تے بندہ گیا (سوچ بچار انسان کو کہیں کا نہیں
چھوڑتی)، کتابی کیڑا، کتابی باتیں، جیہڑی مت بندیاں نال بہہ کے
آندی اے، اوہ کتاباں نہیں دے سکدیاں (جو سمجھ / عقل انسانوں کے
ساتھ بیٹھ کر آتی ہے وہ کتابیں نہیں دے سکتیں) قسم کے محاورے
ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ بڑے بڑے ڈگری یافتہ لوگ یہی
باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پروفیسر صاحب نے ایک
واقعہ سنایا کہ ستر کی دہائی میں ان کی نئی لیکچرر شپ لگی اور کسی
سے دوستی نہ تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی کتاب کالج لے جاتے اور فارغ
پیریڈ میں بیٹھ کر پڑھتے رہا کرتے۔ ایک دن سینئر پروفیسر نے ان
سے پوچھا کہ وہ مقابلے کا امتحان کب دے رہے ہیں؟ انہوں نے

جواب دیا کہ وہ تو مقابلے کا امتحان نہیں دے رہے ۔ اس پر وہ سینئر پروفیسر کہنے لگے کہ پھر آپ ہر وقت کتابیں کیوں پڑھتے رہتے ہیں؟

ایسا ہی ایک اور واقعہ ہے۔ میرے ایک دوست نے بتایا کہ یاروں کی محفل میں بیٹھے قیام پاکستان کے موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ کچھ دوستوں کا خیال تھا کہ پاکستان دو قومی نظریے کی وجہ سے بنا ہے اور کچھ کا خیال تھا کہ اس وقت کی سیاست اور معیشت کا اس میں خاصا بڑا کردار تھا۔ سبھی خاصے پڑھے لکھے حضرات تھے اس لیے یہ بحث علمی تھی اور کتب کے حوالے بھی دیئے جا رہے تھے۔ جب دو قومی نظریے والی ٹیم لاجواب ہو گئی تو دو منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر ایک دو قومی نظریے والا دوست بولا "تیس برس پہلے جب میں ایم اے ہسٹری کر رہا تھا تو پروفیسر صاحب نے ایک بات بالکل صحیح کی تھی ، وہ یہ کہ زیادہ کتابیں پڑھ کر بندے کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔"

ہم جو کہتے رہتے ہیں کہ دوسری قوموں کے تاریخ دان جھوٹی تاریخ لکھتے رہتے ہیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے تاریخ دان پنجابیوں کی علم دوستی کی ثقافت کے بارے میں جھوٹی تاریخ رقم کرتے رہے ہوں؟ کہاں ہزار برسوں سے پنجابی قوم دنیا کی سب سے اعلیٰ تہذیب یافتہ قوم ہو۔ پنجابی عالموں نے عرب اور یورپ کو علم و حکمت سکھایا ہو؟ اور اب یہ حال ہے کہ کتاب پڑھنے والے کو کتابی

کیڑا، ہومیوپیتھک قرار دے دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی قوم اتنا ہی زوال پذیر ہو جائے؟

اب سوچنے سمجھنے کا تکلف بھی ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ کہاں رہنا ہے سے لے کر کارن فلیکس کون سے کھانے ہیں تک کے فیصلے ہم ٹی وی کمرشل دیکھ کر کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک دوست کہنے لگا کہ تم نے موبائیل فون ایپل کا کیوں نہیں رکھا؟ میں نے کہا کہ یار وہ خاصا مہنگا ہوتا ہے۔ یہ اس سے چوتھائی قیمت کا ہے اور اچھا کام کرتا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کہنے لگا، نہیں یار یہ تمہارے اسٹیٹس کے ساتھ نہیں جاتا۔ ویسے کہہ تو وہ صحیح رہا تھا کہ آج کل کپڑے دیکھ کر اندازہ لگاتے ہیں کہ بندہ اچھا ہے یا گھٹیا؟ ایک دن ایک دوست نے نیا فون لیا تو زبردستی مجھے دکھانے لگا کہ دیکھو اچھا ہے نا؟ کافی دیر کے بعد مجھے سمجھ آیا کہ وہ مجھے فون نہیں اپنا اسٹیٹس دکھا رہا تھا۔ ہمارے ذہن اتنے ماؤف ہو چکے ہیں کہ ہم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہمارے سب فیصلے دوسروں کے دیکھا دیکھی ہی ہوتے ہیں۔ یا لوگوں کو دیکھ کر یا ٹی وی اشتہار دیکھ کر۔ سُن سُنا کر چیزیں لے لیں۔ برانڈڈ چیزیں لے لیں۔ یہی حال اُس فون والے دوست کا تھا۔ جو لے تو اُس نے لیا تھا لیکن اب مجھ سے پوچھ کر تسلی کر رہا تھا کہ جو لیا وہ صحیح لیا ہے یا نہیں؟

کچھ سال پہلے ہمارے ایک جاننے والے کا بیٹا تیسری جماعت میں آیا تو اس کا سکول بدلا گیا۔ نئے سکول سے پہلے دن واپس آیا تو باپ سے لڑنے لگا کہ مجھے لینے کے لیے سکول کیوں آئے؟ ہوا یوں کہ وہ بچہ اپنے جس ہم جماعت کے ساتھ بیٹھا اس نے پوچھا کہ وہ کس چیز پر سکول آتا جاتا ہے؟ بچہ نے کہا کرولا گاڑی پر۔ ہم جماعت نے اُسے بتایا کہ میں ہونڈا گاڑی پر آتا جاتا ہوں۔ جب چھٹی ہوئی تو بچے کی کرولا تھی رکشہ اور ہم جماعت کی ہونڈا تھی موٹر سائیکل۔ اب بچہ اپنے باپ سے جھگڑ رہا تھا۔ جب باپ نے سمجھایا کہ اس کی گاڑی بھی تو سائیکل نکلی تو بچے کو کچھ قرار آیا۔ اب یہ حال ہے کہ تیسری جماعت کے بچے بھی اسٹیٹس کونشیئس ہو چکے ہیں۔ ہم کیا بن گئے ہیں اور اپنی اولاد کو کیا بنا رہے ہیں؟

بچوں کی کوئی بھی بات کر لو تو ایک ہی راگ سنائی دیتا ہے کہ بڑے اپنے بچوں کا کبھی بُرا نہیں چاہتے۔ سننے میں یہ بات اچھی بھی لگتی ہے۔ ویسے یہ عام بات ہے کہ بچے کوئی بھی سوال پوچھ لیں تو ان سے علمی و ادبی بحث کرنے کی بجائے ہم انہیں جھڑک دیتے ہیں کہ تم کو نہیں پتا۔ بس جس طرح بڑے بزرگوں نے کہا ہے اُسی طرح ٹھیک ہے۔ گھر اور سکول ایک ہی حال ہے۔ اس طرح بچوں کا دماغ بند کر کے، ان کی عزت نفس کو چوٹ دے کر بڑے کس طرح اپنے بچوں کا بھلا کرتے ہیں یہ سمجھ سے باہر ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ ساری ایجادات اور ترقیاں انگریزوں کے بچے
کرتے ہیں۔ ننھے دماغوں پر لوہے کے خول چڑھا کر انہیں دولے شاہ
کا چوہا بنا دیتے ہیں اور پھر ان کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے بڑے ہو
کر کیا بننا ہے ، انجینئر یا ڈاکٹر؟ اور معصوم ذہن جو قدرتی طور پر فن
کار یا وکیل یا کچھ اور ہوتا ہے، ساری عمر کے لیے عذاب میں پڑ
جاتا ہے اور اس عذاب میں ڈالنے والے اس کے اپنے بڑے ہوتے
ہیں۔ پھر اگر پڑھے لکھے بچے کے امتحان میں کم نمبر آ جائیں تو اُسے
ہر وقت برا بھلا کہا جاتا ہے۔ نالائق، فیلیئر، نکھٹو، ناکارہ اور فلاں کے بچے
کو دیکھو، فلاں کے بچے کو دیکھو۔ بچے بے چارے کو لگتا ہے کہ وہ
دنیا کا سب سے گھٹیا اور نالائق بچہ ہے۔ وہ ایسے احساس کمتری میں
مبتلا ہو جاتا ہے کہ پھر ساری زندگی اپنی نظروں میں اُٹھ نہیں پاتا۔
پڑھنے کے بعد بھی اگر وہ زیادہ کما نہ سکے تو ہر وقت کا لعن طعن۔
پتا نہیں کون کہتا ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کا بُرا نہیں چاہ سکتے ؟
مجھے تو آجکل والدین کم اور جلاد زیادہ نظر آتے ہیں۔ اگر بچہ زیادہ
لائق نہیں، زیادہ پیسہ نہیں کما سکتا تو اُسے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے
کوئی گھٹیا چیز خرید لائے ہوں۔ بچہ نہ ہو گیا، جانور ہو گیا۔ نفع
نقصان کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا؟ اپنا بچہ بھی نہیں؟ اور پھر
شادی۔ شادی بیاہ کرتے ہوئے بڑے بڑے حساب لگاتے ہیں۔ ہمارا
خاندان کیا ہے ، رتبہ کیا ہے؟ دوسروں کا کیا ہے؟ لڑکے والے فکر

کرتے ہیں کہ لڑکی والے کتنے امیر ہیں کتنا جہیز دیں گے؟ ان کے
کنکشن کتنے ہیں؟ ہمارے بیٹے کی ترقی میں کتنی مدد ہو سکے گی؟
دوسری طرف لڑکی والے دیکھتے ہیں کہ یہ کتنے امیر ہیں؟ ہماری بیٹی
کو کیا دے سکیں گے؟ اور دونوں یہ سوچتے ہیں کہ یہ ہمارے
مقابلے کے بھی ہیں؟ لوگ کیا کہیں گے؟ اس سارے جھمیلے میں یہ
نہیں دیکھتے کہ ہمارے بچے کیسے ہیں؟ ان کے مزاج آپس میں ملتے
ہیں یا نہیں؟ جنہوں نے ساری عمر ساتھ گزارنی ہے وہ کیا چاہتے
ہیں؟ کیا سوچتے ہیں؟ یہ باتیں کوئی نہیں سوچتا، کوئی نہیں پوچھتا۔
پوچھیں بھی کس طرح؟ کبھی بھینسوں سے کسی نے پوچھا کہ بھئی وہ
چاہتی کیا ہیں؟ ان کے ملاپ کا فیصلہ بس ان کے مالک کا ہوتا ہے۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ بڑے اپنی اولاد کا بُرا نہیں چاہتے
لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی تو بُرا کیا جا سکتا ہے ، جسے روکنے کے لیے
عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے آج کے بڑے تو مجھے صاحباں
جیسے ہی لگتے ہیں جس نے مرزا کے تیر اس لیے توڑ دیئے کہ کہیں
میرے بھائیوں کو مار نہ ڈالے اور میں اپنے بھائیوں کو واسطہ دے
کر مرزا کو مارنے سے روک لوں گی لیکن بھائیوں نے مرزا کو ہی مار
ڈالا اور وہ روتی رہ گئی ۔ اسی طرح بچوں کی زندگی تباہ کر کے والدین
افسوس کرتے ہیں کہ ہماری اولاد خوش نہیں ہے۔ ہمیں سکون نہیں۔
یہ ملک ہی ایسا ہے، ہماری قسمت ہی خراب ہے ، انہوں نے تو کبھی

اپنی اولاد کا برا نہیں چاہا۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ جہنم کی راہ نیک نیتی سے اٹی پڑی ہے۔

اسی طرح کے بڑوں کی ٹریننگ کام دکھاتی ہے تو لالچی، خود غرض اور سوچ سے عاری بچوں کی کھیپ تیار ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنے بڑوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ بڑوں کے ساتھ اچھا نہیں کرتی اور اپنی اساس کے ساتھ بھی۔ میں سمرقند میں 'ریگستونے' دیکھ رہا تھا۔ 'ریگستونے' وہاں ریگستان کو کہتے ہیں۔ یہ جگہ ویسے ریگستان نہیں تھا۔ ایک بڑا پکا میدان تھا جس کے تین اطراف میں تین تاریخی مدرسے بنے ہوئے تھے اور ایک مدرسہ مرزاالغ بیگ نے بنوایا تھا۔ مرزاالغ بیگ امیر تیمور عرف تیمور لنگ کا پوتا تھا اور سمرقند کا بہت ہی علم دوست بادشاہ بھی تھا۔ اس نے سمرقند میں ایک عظیم الشان رصد گاہ بنوائی تھی جس سے ستاروں کی چال کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا تھا اور کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ الغ بیگ خود بھی سائنس دان تھا اور اس کی کتابیں اس کے ایک ترک شاگرد علی قوشچی نے الغ بیگ کے بیٹے کی جاہلیت سے بچا کر، ترکی لے جا کر چھپوائیں جو یورپ میں خاصی مقبول ہوئیں۔ میں نے اپنی گائیڈ سے پوچھا کہ یہاں کوئی ریگستان نہیں ہے ، ماورا النہر کا علاقہ بھی پہاڑی ہے تو اس جگہ کو ریگستان کیوں کہتے ہیں؟ وہ بتانے لگی کہ اس زمانے میں سمرقند تجارت کا عالمی مرکز تھا اور دوسرے ملکوں

سے یہاں بڑے بڑے قافلے آکر رُکا کرتے تھے۔ قافلوں کے ساتھ
بے شمار گھوڑے اور گدھے اور دوسرے جانور بھی ہوتے تھے جن
کے فضلے سے گندگی پھیلتی تھی۔ اس لیے دوسرے علاقوں سے یہاں
بہت ساری ریت پھیلا دی گئی تھی۔ اس لیے اس علاقے کا نام
ریگستان ہو گیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ میری گائیڈ کی انگریزی خاصی
اچھی تھی۔ میں نے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ٹوورازم کے کورس میں
انگریزی خاص طور پر سکھائی جاتی ہے۔ بات سے بات نکلی میں نے
پوچھا کہ کیا وہ ازبک ہے؟ کہنے لگی کہ نہیں میں قازق ہوں۔ میں
نے پوچھا کہ آپ کی زبان بھی ازبک ہے؟ کہنے لگی کہ نہیں ہماری
اپنی مادری زبان ہے۔ ویسے ہم زیادہ ازبک یا روسی زبان بولتے ہیں لیکن
اب انگریزی مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن میری ماں بولی قازق
زبان ہے۔ میں نے اس کے بچوں کے بارے میں پوچھا۔ وہ یونیورسٹی
میں پڑھتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ بچوں کے ساتھ قازق بولتی
ہو؟ کہنے لگی ہاں مگر وہ ازبک یا روسی میں جواب دیتے ہیں اور اب
انگریزی سیکھ رہے ہیں۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ یہ ہمارے والا ہی
حساب ہے۔ ہمیں پنجابی آتی ہے لیکن ہم قریبی رشتے داروں یا
دوستوں کے علاوہ کسی سے کم ہی پنجابی بولتے ہیں۔ بچے ہمارے ساتھ
نہیں بولتے اور ہم انہیں نہیں کہتے کہ پنجابی بولیں۔ انہیں اُردو بولتا
دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور انگریزی سکھاتے ہیں۔ پھر مجھے خیال آیا

کہ نہیں یہ قازقوں کا ہمارے والا حساب نہیں۔ دنیا میں بڑی زبانیں
چھوٹی زبانوں کو کھا جاتی ہیں۔ نئی نسل میں بچے ماں بولیاں چھوڑ کر
بڑی زبانیں سیکھ رہے ہیں لیکن وہ ماں بولی یہ سوچ کر چھوڑتے ہیں
کہ ہم اس زبان میں سائنس یا ادب نہیں پڑھ پائیں گے۔ بڑی
زبانوں میں سائنس اور ادب کا کام بھی ہو رہا ہے اور وہ دوسری
زبانوں کے سارے کام خود ترجمہ بھی کر رہی ہیں۔ اس لیے بچے
سمجھتے ہیں کہ بڑی زبانیں زیادہ فائدہ مند ہیں جبکہ پنجابی زبان ان
سب سے بہت آگے ہے۔ پنجابی شخص صرف یہ ہی نہیں سمجھ رہا کہ
پنجابی چھوٹی اور بے کار زبان ہے اور اس میں کوئی کام نہیں ہو رہا
بلکہ وہ یہ بھی سمجھ رہا ہے کہ پنجابی ایک گھٹیا زبان ہے۔

میں پشاور میں تھا تو ہوٹل میں ایک پٹھان کے ساتھ دوستی
ہو گئی۔ وہ صوبہ خیبر پختون خواہ کا سرکاری ملازم تھا۔ زبان پر بات
ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ آپ لوگ عام طور پر کون سی
زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہنسنے لگا کہنے لگا کہ بازار ہو، فائیو سٹار
ہوٹل، دوست ہوں یا اجنبی، دفتر میں کلرکو ں کی باتیں ہوں یا خوش
گپیاں یا چیف سیکرٹری کی سرکاری میٹنگ ، اگر سب پشتون ہیں تو پھر
بات صرف پشتو میں ہی ہو گی۔ میں نے اپنے پنجاب پر نظر دوڑائی
تو مجھے اپنی ماں بولی نہیں اپنا آپ گھٹیا لگا۔

ہمارے اُستاد ٹیوشن پڑھا پڑھا کر اور سکول لمبی چوڑی فیسیں

لے کر بیوپاری اور کاروباری ادارے بن گئے ہیں اور ٹھیک بنے ہیں۔
کیونکہ ہم نے خود اپنی تعلیم کو کاروبار بنالیا ہے۔ بچے کو سکول اس
لیے بھیجتے ہیں کہ وہ نوکری حاصل کر سکے، پیسہ کما سکے۔ سائنس،
اکاؤنٹنگ یا مینجمنٹ پڑھائی ہے کیونکہ ان میں پیسہ کمانے کے امکانات
زیادہ ہیں۔ ککڑی اوہ لینی جیہڑی کُڑ کُڑ کر دی اے، تے ڈگری اوہ
لینی جیہڑی ٹکر دیندی اے (مرغی وہ لینی جو کڑ کڑ بولتی ہو اور
ڈگری وہ لینی جو کما کر دیتی ہو)۔ ہم بچوں کو بندہ بنا رہے ہیں یا
کیلکولیٹر؟ جو بچہ آئن سٹائن کے کام کو بڑھا سکتا ہے ہم اُسے جوتے
مار مار کر ایم بی اے کرواتے ہیں اور جو پکاسو جیسا فنکار بن سکتا ہے
اُسے ہم مار مار کر ڈاکٹر بنا دیتے ہیں اور پھر یہ خود کو ناکارہ سمجھ
کر ساری عمر احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں، اور دن رات اپنے
بزرگوں کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ بھی کیا ڈگری ہے
جو رٹے اور نقل مار کر لی جائے؟ ہم اپنی اولاد کے ساتھ زیادتی
نہیں کر رہے بلکہ ان پر ظلم کر رہے ہیں۔ اس طرح کی تعلیم و
تربیت دے کر بچوں کو دنیا کے آگے پھینک دینا بالکل ایسا ہی ہے
جیسے انہیں فوجی ٹریننگ دیئے بغیر ہی نقلی بندوقیں تھما کر میدان
جنگ میں بھیج دینا۔

پنجاب دنیا کے عظیم دیسوں میں سے ایک ہے۔ خوبصورت
ترین دیسوں میں سے ایک۔ اس کی زمین زرخیز ہے اس کے باسیوں

کے دماغ زرخیز ہیں۔ اس نے دنیا کی سب سے قدیم اور سب سے عظیم اور سب سے بڑی تہذیب کو جنم دیا۔ اس کی بیٹیاں بیٹے دلیر اور عقلمند ہیں۔ چاہے پچھلے زمانے کی تاریخ دیکھ لیں یا موجودہ زمانے کی بات کر لیں، دنیا میں پنجابیوں نے ہر میدان میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ پنجابیوں کا ظرف بھی اتنا بڑا ہے کہ چاہے کوئی قوم ہو یا اکیلا بندہ یا مذہب، جو بھی پنجاب میں آیا، پنجابیوں نے اُسے بڑے دل سے خوش آمدید کہا۔

کسی بھی زاویے سے دیکھ لیں پنجاب کا بڑا پن چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔ ہمارے پنجابی آباء ہیرے تھے اور ہمارے پنجابی بہن بھائی ہر طرف موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ پتا نہیں کیوں نہ تو ہم اپنا ماضی دیکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے اردگرد بکھرے ان موتیوں کی قدر کرتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے ہماری آنکھوں پر عینک لگا دی ہو کہ ہمیں صرف یہی نظر آتا ہے کہ پنجاب بُرا ہے اور پنجابی بُرے لوگ ہیں۔ ہمیں ذہنی غلامی کی ان زنجیروں کو توڑنا ہو گا۔ بصورت دیگر تاریخ میں ہم پنجابیوں کا کہیں ذکر باقی نہ رہے گا۔

انسان کی ترقی نسلوں کا عمل ہوتی ہے۔ ایک نسل ساری زندگی ترقی کرتی ہے اور اپنا سارا علم اگلی نسل کو دے جاتی ہے اور ہر نسل کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے آباء کی ترقی کو مزید

آگے بڑھائیں تا کہ ان کے بزرگ بھی ان پر فخر کر سکیں۔ اپنی
زبان چھوڑ کر، اور اپنا تابناک ماضی بُھلا کر ہم خود کو بھول رہے
ہیں۔ ہم یہ بھول رہے ہیں کہ ہم اپنے دیس کے باسی ہیں اور یہ
بھی بھلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے آباء واجداد ہزاروں
برس سے یہیں بستے تھے۔ ہمارا رہن سہن، ہماری سوچ، ہماری جڑیں
اسی زمین میں ہیں۔ ہماری پہچان، ہماری شناخت پنجاب ہے۔ ہم پاکستانی
بھی ہیں اور مسلمان بھی لیکن ہماری مٹی، ہمارا رہن سہن اور ہمارا
سوچنے کا انداز پنجابی ہے۔ پنجابی ہوتے ہوئے بھی ہم بہت کچھ ہو
سکتے ہیں لیکن اگر ہم نے اپنی پنجابی جڑیں کاٹ ڈالیں تو پھر ہم کچھ
بھی نہیں رہ جائیں گے۔ ہماری کوئی وقعت باقی نہیں رہ جائے گی۔
ہماری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں۔

....

کتابیات

1. ہندوستان کی کہانی از ڈاکٹر مبارک علی۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2009.

2. تاریخِ پنجاب، قدیم دور تا بٹوارا 1947ء از ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری۔ فِکشن ہاؤس، لاہور، 2018.

3. Five Thousand Years of Pakistan, An Archaeological Outline by R.E.M. Wheeler. Royal Book Company, Karachi, 1950, 1992.

4. History of Pakistan, Pakistan Through Ages by Prof. Dr. Ahmad Hasan Dani. Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2008.

5. تارِیخ، پاکستان کے متنازعہ ادوار از مخدوم ٹیپو سلمان۔ فکشن ہاؤس، لاہور، 2017.

6. The Wonder that was India, A. L. Basham. Rupa & Co, New Delhi, 1967 (22nd impression, 1994).

7. Gem in the Lotus, The seeding of Indian Civilisation, Abraham Eraly. Penguin Books, India, 2002 (ed. 2015).

8. The First Spring, Life in the Golden Age of India, Part-1, Abraham Eraly. Penguin Books, India, 2011 (ed. 2014).

9. A New History of India, Stanley Wolpert. Oxford University Press, USA, 1977 (2000).

10. India An Introduction, Khushwant Singh. Vision Books, India, 1990 (2007).

11. A short History of Muslim Rule in India, Ishwari Prasad. Indian Press, 1965.

12. A New History of Indo-Pakistan, K. Ali. Aziz Publishers, Lahore, 1978.

13. Muslim Rule in India and Pakistan (711-1858 A.C.), Dr. S. M. Ikram. Institute of Islamic Culture, Lahore, 1989.

14. The Fall of the Kingdom of the Punjab, Khushwant Singh. Penguin, 1962 (2014).

15. The Oxford History of India, Vincent A. Smith. Oxford University Press, 1958 (1983).

16. A History of India 1, Romila Thapar. Penguin Books, 1966

(1975).

17. A History of the Peoples of Pakistan Towards Independence, J. Hussain. Oxford University Press, 1997 (1999).

18. Punjab A History from Aurangzeb to Mountbatten, Rajmohan Gandhi. Aleph, 2013.

19. www.scribd.com

20. www.wikipedia.org

21. Indian Cultures as Heritage, Contemporary Pasts, Romila Thapar, Aleph, 2018.

22. Being Pakistani, Society, Culture and The Arts, Raza Rumi, HaperCollins Publishers India, 2018.

.23 پنجابی بولی دا پچھوکڑ، محمد آصف خاں، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، (1996, 2014).

.24 نِک سُک تے ہور نِک سُک، محمد آصف خاں، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور۔

.25 پنجابی زبان، سردار محمد خاں، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، 2017.

.26 اُجڑے دراں دے درشن (پاکستان وچلے جین مندراں دی تواریخی فکشن)،

اقبال قیصر، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، 2017.

27. وحدت الوجود تے پنجابی شاعری، سید علی عباس جلالپوری، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، 1977 (2010).

28. پنجابی بولی دا پچھوکڑ، محمد آصف خاں، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، 1996 (2014).

29. The Black Swan, The Impact of the Highly Improbable, Nassim Nicholas Taleb, Penguin Books, 2007 (2010).

30. www.ted.com

31. The Alchemist, Paulo Coelho, HarperCollins, 1993.

32. Amritsar 1919, An Empire of Fear & The Making of A Massacre, Kim A. Wagner, Yale University Press, 2019.

33. پنجاب کی انقلابی تحریکیں 1906 – 1946ء، پروفیسر ستیہ ایم رائے، ترجمہ محمود زمان، دوسرا ایڈیشن 2009ء، جمہوری پبلیکیشنز، لہور۔

•••••